گڈی کی کہانی
ممتاز مفتی

فہرست

پہلی بات

دنیا مجھے ممتاز مفتی کے بیٹے کی حیثیت سے جانتی ہے۔ مگر خدا گواہ ہے تمام زندگی نہ ممتاز مفتی نے میرا باپ بننے کی کوشش کی نہ میں نے روایتی بیٹا بن کر دکھایا، نہ ہم دونوں کی دلچسپیوں میں مماثلت تھی، نہ پہننے اوڑھنے میں، نہ بات چیت میں، نہ سوچنے کے انداز میں، میں ہر بات ہر واقعے کو عقل اور حقائق کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی، ممتاز مفتی ایک تصوراتی دنیا کا باشندہ جہاں معجزے اور عقل دنگ کر دینے والے واقعات روز کا معمول ہوتے۔

افسانہ نہ کبھی میں نے پڑھنے کی کوشش کی نہ ممتاز مفتی نے کبھی کہا۔ ہم دونوں ساری زندگی ریل کی دو پٹریوں کی طرح رہے جو ساتھ ساتھ تو چلتی ہیں مگر ملتی کبھی نہیں۔ یہاں مجھے اُنہی کی ایک بات یاد آ رہی ہے کہ، دو مقامات سے دیکھو گے تو ٹھیک سے نظر نہیں آئے گا: ۱) دور سے، یا ۲) بہت قریب سے

شاید میں اُنہیں بہت قریب سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے اُن کی پوری زندگی احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ بابا جس کے ساتھ میں لنگوٹیے یار کی طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا تھا، کھوکھوں میں بیٹھ کر چائے پیتا تھا، وہ جو کل تک میرے ساتھ گنڈیریاں چوستا بازاروں میں پھرتا، ریڑھیوں سے چاٹ اور تکے کباب کھاتا اور گھٹیا فلمیں دیکھتا تھا چپکے سے کس مقام پر جا کھڑا ہوا ہے۔

میری اور ممتاز مفتی کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ ہم ایک دوسرے سے لڑے، روٹھے، ایک دوسرے پر تنقید کی، مگر کوئی کسی کو قائل نہ کر سکا۔ ممتاز مفتی کے نظریات پتھر پر لکیر ثابت ہوئے۔ میں گھبرا کر بار بار اپنے آپ پر نظرِ ثانی کرتا

رہا۔ آخر ایک دن میں پھٹ پڑا اور زندگی میں پہلی بار اپنے باپ سے مخاطب ہوا: ''ابو، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے دوست بناؤں گا، اپنے مشاغل اپناؤں گا اور اپنی شناخت پیدا کروں گا۔''

ممتاز مفتی کو ایک دھچکا لگا، شاید اُسے بھی پہلی دفعہ احساس ہوا وہ میرا باپ بھی ہے۔ لہذا اُس نے بھی باپ بن کر جواب دیا مسکرایا اور بولا ''ٹھیک ہے عکسی جو تمہاری مرضی۔''

یوں بظاہر میں نے اپنا راستہ جدا کر لیا مگر حقیقتاً ہم پھر بھی ساتھ ساتھ ہی چلتے رہے۔ اس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب اچانک ۱۹۹۵ء میں ممتاز مفتی کا سفر ختم ہو گیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو عمر بھر ساتھ نبھانے والا وہ بابا اب میرے ساتھ نہیں تھا مگر جانے میں اپنی کمر پر لادا ہوا وہ اسباب میرے حوالے کر گیا جسے وہ تمام عمر اٹھائے پھرا۔ اسباب کی اس پوٹلی میں اُس کی وہ گرانقدر تحریریں، کتابیں، خطوط اور ڈائریاں بھی ہیں جنہیں میں نے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ اس میں ہر عمر، جنس، رتبے اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے اُن لوگوں کی محبتیں ہیں جنہیں میں جانتا تک نہیں، اس پوٹلی میں اُن کے وہ نظریات، خیالات اور خواب ہیں جو وہ پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے دیکھتے رہے۔ اور۔۔۔ اور اس پوٹلی میں عکسی مفتی کے باپ کی وہ شفقت بھری مسکراہٹ ہے جیسے جاتے جاتے انہوں نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا ہو اور اپنی ایک آنکھ دبا کر بولے ہوں ''عکسی! میں نہ کہتا تھا منزل کی طرف جانے والا ہر راستہ روایت کی زمین سے ہو کر گزرتا ہے۔ روایت کی آبیاری کر۔۔۔''

عکسی مفتی

فروری ۲۰۰۳ء

دیباچہ

ممتاز مفتی کو جاننے، اُسے سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں، مگر انہیں پڑھ کر ایک بات جو میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں وہ یہ کہ ممتاز مفتی کا ایک ہی پیغام تھا، ہے اور رہے گا ''محبت اور خدمت''۔ خواتین میں اُن کی مقبولیت دیکھ کر میں بھی اوروں کی طرح بہت عرصہ اس غلط فہمی کا شکار رہا کہ بابا جی بہت رنگین مزاج ہیں۔ اوپر سے فرائیڈ کے نظریات سے متاثر۔ مگر جوں جوں بابا جی کو پڑھتا گیا، اُن کی عقیدت مند خواتین سے ملاقاتیں ہوئیں، اُن کی ڈائریوں اور خطوط تک رسائی حاصل ہوئی توں توں اسرار کے پردے چاک ہوتے گئے اور بالآخر انکشاف ہوا کہ ممتاز مفتی کی محبت اور رنگین مزاجی بچوں کی سی معصوم اور بے لوث تھی۔

ممتاز مفتی نے بہت لکھا۔ اور اُن کے فن و شخصیت پر بہت لکھا گیا۔ اگر اُن کے تمام لکھے کو یکجا کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ شاید انہوں نے لکھنے کے سوا زندگی میں کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں۔ اُن کی مطبوعہ تحریروں سے اُن کی غیر مطبوعہ تحریریں کہیں زیادہ ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہر ادیب اپنے ہی لکھے کو رد کرتا رہتا ہے، ان میں رد و بدل، ترمیم و اضافہ کرتا رہتا ہے، اور پھر یہ بھی کہ ادیب کی بہت سی تحریریں اُس کی زندگی میں اُس کا ذاتی اثاثہ ہوتی ہیں مثلاً اُس کے خطوط، ڈائری، ذاتی مشاہدات و تاثرات وغیرہ۔ مگر ممتاز مفتی جیسے بڑے ادیبوں کی موت کے بعد اُن کے قلم سے نکلی اور اُن سے منسوب ہر تحریر، ہر لفظ قومی اثاثہ بن جاتی ہے۔

کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب میں شامل ممتاز مفتی کے افسانے/ کہانیاں قبل ازیں شائع شدہ اُن کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہ ہوں۔ کچھ ایسے افسانے ہیں جو

اخبارات و رسائل کی زینت تو بنے لیکن کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن میں خود ممتاز مفتی نے ترامیم و اضافے کیے۔ بہر حال سب کچھ ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ ممتاز مفتی کے افسانے / کہانیاں/ڈرامے/سفر نامے/اُن کے لکھے خاکے اور خطوط سب ہمیں زندگی کے کسی نہ کسی ایسے رُخ، کسی ایسے بھید سے آشنا کر جاتے ہیں، ایسی حقیقت سے روشناس کر جاتے ہیں جو ہمارے بہت قریب ہوتی ہے، جسے ہم روز دیکھتے ہیں، مگر اُس کی اہمیت کے اسرار سے ناواقف رہتے ہیں۔ ممتاز مفتی اپنی کہانیوں میں ہمیں انہی اسرار و رموز سے آگاہ کر جاتا ہے۔

عورت ممتاز مفتی کا بہت اہم موضوع رہی ہے۔ اس کتاب میں بھی آپ کو عورت کے حوالے سے بہت کچھ ملے گا۔

ممتاز مفتی کی شہرہ آفاق تصنیف ''علی پور کا ایلی'' میں نے اُن کی وفات کے سات سال بعد پڑھی جب ایک دن نجیبہ عارف نے کہا ''ممتاز مفتی کو جاننے کیلئے یہ کتاب بہت اہم ہے، ساتھ ہی اس سے منسوب ایک قصہ بھی سنا ڈالا کہ ''ممتاز مفتی کے گرویدہ فوج کے ایک جنرل صاحب نے اظہارِ عقیدت کے طور پر کافی تعداد میں ''علی پور کا ایلی'' خرید کر اپنے حلقے میں بانٹ دی۔ بعد ازاں جب خود وہ کتاب پڑھی تو کافی عرصے تک منہ چھپائے پھرتے رہے۔'' یہ سننا تھا کہ اُسی دن ہم علی پور کے ایلی کو گھر لے آئے۔

پڑھنی شروع کر دی، پڑھتے پڑھتے کبھی ممتاز مفتی کی معصومیت پر رونا آتا کبھی چالاکی پر غصہ آتا کبھی سوچتا چنگا بندہ ہے اپنے ہی کپڑے اتارے چلا جا رہا ہے۔ اس دوران مجھے صدر بازار کا ایک فٹ پاتھیا دوا فروش بہت یاد آیا جس کے پاس دو تصویریں ہوتی تھیں، ایک تصویر ایک مدقوق سے قبر رسیدہ آدمی کی تھی جسے وہ مجمعے کو دکھا کر کہتا تھا ''یہ ہوتا ہے غلط کاریوں کا انجام، مگر دنیا کا کوئی مرض لاعلاج نہیں خدا گواہ ہے یہی شخص علاج کے بعد ایسے ایسے شباب سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو گیا''۔ یہ کہتے ہوئے وہ دو عورتوں کی نیم عریاں تصویریں مجمعے کے سامنے فلیش کر کے پلٹ کر رکھ دیتا۔ ''اب میں آپ کو بتاؤں گا اور دکھاؤں گا کہ کیسے''؟ وہ مجمعے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا۔ اور مجمع اس آس میں کہ کب وہ اوندھی پڑی اور تصویریں بھی دکھائے گا کھڑا اُس کی تقریر سنتا رہتا اور بلا آخر قائل ہو کر دواؤں کی پوڑیاں خرید کر گھر کی راہ لیتا۔

ممتاز مفتی کے بارے میں میرا پہلا تاثر کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ بھی ایک مجمع باز شعبدے باز ہے جو ہومیوپیتھی کی پوڑیاں لئے مجمع لگائے بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی کوئی آئیٹم مجمعے کی طرف فلیش کر کے اُسے پھر اُلٹا کر سامنے رکھ لیتا ہے۔ جب چاہتا ہے پورے مجمعے کا سانس روک دیتا ہے، جب چاہتا ہے دلوں کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے، نظریں ساکت کر دیتا ہے، سوچیں بدل دیتا ہے۔ اُسے دوسروں کو اپنی آنکھ سے دکھانا آتا ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے عکسی مفتی صاحب خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ممتاز مفتی کے علمی خزانے تک رسائی کی اجازت دی۔ محترمہ نجیبہ عارف کا مشکور ہوں مجھے انکی مسلسل مدد اور تعاون حاصل رہا۔ نجیبہ عارف پہلی لکھاری ہیں جنہوں نے ممتاز مفتی کے فن و شخصیت پر پی ایچ ڈی کا تھیسس مکمل کیا۔

محترمہ پروین عاطف اور محترمہ صدیقہ بیگم کا مشکور ہوں کہ اُنہوں نے ممتاز مفتی اور عورت کے حوالے سے مجھے سوچ کی ایک نئی سمت دی۔

میں اپنی بات ڈاکٹر امجد ثاقب کے مضمون ''مہا اوکھا مفتی'' میں لکھی ایک بات پر ختم کرتا ہوں کہ ''اگر ممتاز مفتی پاکستان کے نثری ادب کی شناخت ہے تو ہمیں اس شناخت کو لہروں کے حوالے کرنا ہو گا تا کہ ''دکھ کے پانیوں میں گھرے'' ان دیکھے ان جانے جزیرے بھی اس کے سچ سے سیراب ہو سکیں۔''

سید محمد علی

اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۳ء

گنگو

سلطانہ نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی آبگینہ پھوٹ گیا ہو اور نفرت کا ایک بے پناہ طوفان اسے ایک تنکے کی طرح بہائے جا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

سلطانہ نے پوری طاقت سے سنبھلنے کی کوشش کی۔ اس لئے کھڑکی کا ریشمی پردہ سرکا کر باہر نگاہ دوڑائی۔ باغیچے میں گنگو مالی فاتحانہ انداز سے کھڑا پھولوں کی کیاریوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں نگہت پریشان کھڑی تھی۔ برآمدے کے دروازے میں اس کا پالتو کتا ڈبو کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈبو کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے صوفے کی طرف دیکھتے ہوئے باقی کمرے کا پھر سے جائزہ لیا۔ رومان کا وہ رنگین دھندلکا ختم ہو چکا تھا۔ کمرے کی تمام چیزیں اپنے حقیقی روپ میں اجاگر ہو رہی تھیں۔

سلطانہ کی وہ قد آدم تصویر جس میں کچھ دیر پہلے فاتح کا انداز نمایاں دکھائی دیتا تھا اب ایک عام عورت میں بدل چکی تھی۔ ایک ایسی عورت جو مایوسی کو احساسِ فتح کے پردے تلے چھپا رہی ہو۔ جو اپنے آپ کو فریب دینے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے وہ پھولدار ریشمی پردے جو چند منٹ پہلے اس رنگین رومان کے محافظ تھے جس کی تکمیل کے لئے وہ وہاں آئی تھی اب قفس کی تیلیوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ آتش دان پر رکھا ہوا مرمریں کیوپڈ جو کچھ دیر پہلے مسرتِ تسخیر سے سرشار کھڑا تھا اب ایک کھلونا دکھائی دے رہا تھا۔

نہ جانے اپنی حماقت یا فطرت کے تسخر کو محسوس کر کے اس کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اس روز وہ کتنی عظیم توقعات لے کر بیدار ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک وہ دن اس کی زندگی کا سنہرا دن تھا۔ ساری رات اس نے امیدوں کا ایک قصرِ عظیم تعمیر کرنے میں بسر کی تھی۔ کیونکہ اس صبح اس کی زندگی کی واحد امید پوری ہونے والی تھی۔

سلطانہ زندگی سے نامحرم نہ تھی بلکہ محروم تھی۔ وہ زندگی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھنے والی نہ تھی۔ وہ زندگی کے کھیل میں شاطر ہونے کے باوجود ناکام تھی۔ اس نے متعدد بار محفلِ نشاط قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ رنگین بلبلے ابھرتے ہی پھوٹ گئے تھے۔ اور پھر وہی دھچکا۔ وہی مٹیالا اندھیرا اور وہی نفرت کا چلتا ہوا طوفان اور اس میں وہ خود۔۔۔ ایک بے بس تنکا۔

لاشعوری طور پر اسے خواہش تھی کہ اس کا محبوب بلندیوں پر جلوہ گر ہو۔ اور وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے۔ اسے آرزو تھی کہ محبت میں اسے اپنے محبوب کی رخصت اور بے نیازی پر شکایت ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی ایسے فرد کی آرزو کرے جو اس کے حسن کے سحر کو خاطر میں نہ لائے۔ جو اسے پاؤں کی ٹھوکر سے زیادہ اہمیت نہ دے۔ جو اس کی بے بسی پر ترس کھائے صرف ترس۔ جس کا سر اس کے سامنے خم نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ خود مجبور ہو کر اس کے روبرو جھک جائے۔ اور اس کے جسم کا رواں رواں سپردگی کی تاثیر سے بھیگ جائے۔

اس مقصد کے لئے سلطانہ نے بڑے بڑے مغرور اور خودسر جوانوں کو اپنا مطیع بنایا تھا۔ اور بڑے بڑے حیلے بہانوں سے اس سے تخلیے میں ملاقات کرنے کی صورتیں پیدا کی تھیں۔ لیکن تخلیے میں وہ مغرور اور خودسر جوان سب اس کے حسن کی تمازت کے روبرو پگھل جاتے، جیسے آفتاب تلے پالا۔

کیپٹن کرمانی کو پہلی نظر دیکھتے ہی سلطانہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس نے اس کی بلند و بالا نگاہوں، بے نیاز انداز اور بند ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ جن میں تضحیک دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا مقصدِ حیات حاصل ہو گیا ہو۔ یہی تھا وہ جوان جس کے انتظار میں اس نے زندگی کے کئی ایک سال بسر کئے تھے۔ سالہا سال کی

آوارگی کے بعد دفعتاً منزل اس کے روبرو آکھڑی ہوئی تھی۔

اس روز اس کے دل کے تاروں سے تکمیل آرزو کی امید کے سرشار نغمے سنائی دیتے رہے تھے۔

سامنے صوفے پہ وہ نوجوان کیپٹن کرمانی پڑا تھا۔ وہی کیپٹن کرمانی جس سے تخلیے میں ملاقات کرنے کی مجنونانہ دھن میں سلطانہ نے گذشتہ پندرہ دن صرف کر دیے تھے۔ وہی کیپٹن کرمانی جس کے انداز میں کبھی اک شانِ استغنا تھی۔ ایک بے پروائی، ایک انفرادی عظمت، وہی کیپٹن کرمانی۔۔۔ وہ کیپٹن کرمانی جواب تخلیے میں سلطانہ کے قدموں میں پڑا تھا۔ جس کی آنکھیں جونکوں کی طرح سلطانہ کے جوبن سے لٹکی ہوئی تھیں۔ وہی کیپٹن کرمانی تخلیے میں ایک عام ہوس زدہ مرد کی طرح اپنی انفرایت کھو چکا تھا۔۔۔ ایک حقیر کیڑا جو اپنی تھوتھنی بڑھائے اس کی طرف رینگ رہا تھا۔۔۔ ایک پالتو کتا، ایک لاش۔

سلطانہ نے حقارت سے نگاہ پھیر لی اور پھر سے نیم وا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ دیو نما جانگی گنگو مالی کسی ہاتھ میں اٹھائے برآمدے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں نفرت کھول رہی تھی۔ سلطانہ نے ایک جھرجھری لی اور محسوس کیا جیسے اس کی روح کے نچلے تار تھرتھرانے لگے ہوں۔ وہ جانتی تھی گنگو کے دل میں اس کے لئے بے پناہ نفرت ہے۔ اس کی نگاہ میں سلطانہ کا حسن کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

سلطانہ نے نگاہ پھیر لی۔ دوسری طرف نگہت اداس بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں نگہت کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا کہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے۔ وہ عورت تھی۔ وہ اس کے دل کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ لیکن نہیں یہ ممکن نہ تھا۔ اس کا احساسِ وفا اسے اس بات کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے سبھی نوکر اسے عیاش عورت سمجھتے تھے۔ اس کی پلکوں پر نمی سی تیرنے لگی۔

کیوں۔۔۔ وہ اس لاش کی طرف سرسری نگاہ ڈال کر سوچنے لگی۔ کیوں وہ سب پلپلاتے ہوئے کیڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وہ میجر، وہ نواب زادہ، وہ مسٹر رحمان اور

اب یہ کیپٹن کرمانی۔

کیا یہ وہی کیپٹن کرمانی ہے جس کی آنکھوں میں بغاوت کی چمک تھی۔ جس کے ہونٹوں میں بے پناہ تمسخر کی جھلک تھی۔ اس نے حقارت سے اس کی ہوس سے پھولی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے لٹکے ہوئے ہونٹوں سے گویا رال ٹپک رہی تھی۔ سلطانہ کی نگاہ کی گرمی سے وہ پلپلا اٹھا اور کیڑا بن کر رینگنے لگا۔ کیوں؟ سلطانہ کے دل کی گہرائیوں سے ایک چیخ اٹھی۔ کیوں وہ اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ محبوب ہوتے ہیں۔ کیوں وہ اپنی خودی کی قندیل کو اپنے ہاتھوں سے بجھا دیتے ہیں۔ کیا مجھے مایوسی کے اندھیرے میں دھکیلنے کے لئے۔ اندھیرا اندھیرا، کمرہ اس کی نگاہوں تلے گھومنے لگا۔ نہیں نہیں وہ چلائی، پالتو کتے نہیں، پلپلاتے کیڑے نہیں، لاشے نہیں، مجھے ساتھی کی ہوس ہے۔ جیتے جاگتے ساتھی کی بلند و بالا محبوب کی۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئی نہ جانے کیوں دفعتاً وہ رکی۔ اس کے روبرو دیو ہیکل مالی کھڑا تھا جس کے ہونٹوں میں حقارت دبی ہوئی تھی۔

ہوں، وہ سوچنے لگی، مجھے عیاش سمجھتا ہے۔ عیاش، دفعتہً اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ایک دیوانہ کن خیال۔ گنگو۔۔۔ اس نے پکارا۔ ہمارے ساتھ آؤ۔۔۔ اور وہ چل پڑی۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر اس نے اس بے حس جانگلی کو ڈانٹا۔ گنگو! اندر آؤ۔۔۔ دروازہ بند کردو۔

گوشت کی پہچان

اس روز بھی یوآصف کے بنگلے پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سارا بنگلہ یوں لرز رہا تھا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔

اندر ساحرہ غصے میں چلا رہی تھی ”لوگ آتے جاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔“

ثریا کھڑکی سے لگی باہر جھانک رہی تھی اور ساتھ ہی صورت حال پر رننگ کمنٹری کر رہی تھی۔

فاروق غصے میں یوں پاؤں چلا رہا تھا جیسے فٹ بال کھیل رہا ہو۔ وہ حتمی کو ڈانٹ رہا تھا ”حتمی سٹاپ وصل ان ڈگنیٹی میرے دوست آنے والے ہیں وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔“

باورچی خانے میں دونوں نوکر بشیرا اور عیشاں منہ کان جوڑ کر بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ عیشاں ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہہ رہی تھی ہے ”اللہ صاحب کو کیا کہیں گے۔“

ممی خود سخت گھبرائی ہوئی تھی اس کی سہیلی مسز وسیم آنے والی تھی وہ دیکھے گی تو باتیں بنائے گی خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہوگی۔

بنگلے پر یہ قیامت اس لئے ٹوٹی تھی کہ بڑے ابا نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کمرے میں پڑے رہنے کی بجائے باہر پورچ کے قریب کھاٹ بچھا کر دھوپ میں بیٹھا جائے۔ اور وہ اپنا جائے نماز۔ مٹی کا لوٹا اور تسبیح اٹھا کر باہر آ بیٹھے تھے۔

بیچارے بڑے ابا کو کیا پتہ تھا کہ اس معصوم سے فعل سے بنگلے کے سٹیٹس کا معیار دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ انہوں نے گاؤں میں ساری زندگی گھر سے باہر گلی کے متصل دھوپ میں کھاٹ پر بیٹھ کر بسر کی تھی۔ اس سے تو الٹا عزت بڑھتی تھی آتا جاتا سلام کرتا تھا

مزاج پوچھتا تھا انہیں کیا پتہ تھا کہ بنگلے اور گھروندے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ عزت کیا چیز ہے اور سٹیٹس کیا شے ہے۔

وہ شہر آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ان کے اکلوتے بیٹے آصف نے ماں کی وفات کے بعد انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ شہر میں آکر اس کے پاس رہیں اور اسے خدمت کا موقعہ دیں۔

جب آصف انہیں شہر لایا تھا تو اسنے اپنی بیگم بچوں اور نوکروں سے باآواز بلند کہہ دیا تھا کہ ابا کو کوئی تکلیف نہ ہو ان کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے اور ان کی ہر خواہش کا خیال رکھا جائے۔

آصف بچارے کو کیا پتہ تھا کہ ابا پورچ کے پاس کھاٹ ڈال کر دھوپ کھانے کی بیہودہ خواہش رچا بیٹھیں گے۔ جب بیگم نے آصف کو فون پر صورت حال بتائی تو آصف کا دل دھک سے رہ گیا۔

آصف کو ابا سے بڑی محبت تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ بنگلے کے رن وے پر مصلہ بچھا کر سامنے مٹی کا لوٹا رکھے سجدے کرتے رہیں اور ہر آنے جانے والے کو آصف کے متعلق غلط امپریشن دیتے رہیں۔

آصف کو اپنے ابا کے خلاف صرف ایک شکایت تھی کہ وہ کھلے بندوں مسلمان تھے اسے ان کے مسلمان ہونے پر اعتراض نہ تھا کھلے بندوں پر اعتراض تھا وہ اسلام کو یوں سینے پر لگائے پھرتے تھے جیسے وہ تمغہ ہو اعزازی تمغہ۔ مثلاً سب سے بڑا ظلم جو انہوں نے آصف پر کیا تھا کہ اس کا نام برکت اللہ رکھ دیا تھا۔

جب وہ کالج میں پہنچا تو اسے اپنا نام کھلنے لگا تھا لو بھلا یہ اللہ کیا ہوا اس اللہ نے تو میرے نام کو الی لگا رکھی ہے۔ وہ بہت سوچتا رہا کہ اپنے نام کو کیسے پڑھے۔ کالج میں ایک پروفیسر تھا یو کرامت۔ آصف نے سوچا میں بھی اللہ کو کیمافلاژ کر کے یو برکت بن جاؤں لیکن دقت یہ تھی کہ برکت خود اچھا لفظ نہ تھا۔ اس میں سے بھی اللہ کی بو آتی تھی۔ لہذا اسنے

اپنے سارے نام کو بی یو میں چھپا کر ساتھ آصف بڑھا لیا تھا۔ باپ اور بیٹا دونوں میں بنیادی فرق بس یہی تھا کہ بیٹا بی یو آصف بن گیا اور باپ وہی رحمت اللہ ہی رہے تھے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آصف کے دل میں اسلام کی عزت نہ تھی۔ بڑی عزت تھی دراصل آصف سوچ بچاری مسلمان تھا آنکھیں بند مسلمان نہیں انٹلکچوئل مسلمان تھا لکیر فقیر نہیں۔

وہ مجلس میں بیٹھ کر اسلام پر اکثر بات چیت کیا کرتا تھا Dispensatory ڈسکس کیا کرتا تھا۔ جس طرح وہ دفتر کی فائلوں کو ایگزامن کرتا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے احکامات پر بے لاگ لگاؤ غور کرنے کی عادت تھی جس طرح ہر پڑھے لکھے میں ہوتی ہے۔ اور پھر اپنی لاگ کے زور پر غور کرتا کہ کہاں کہاں کانٹرڈکشنز موجود ہیں۔ فلاں بات کس طریق سے ذہن نشین کرانی چاہیے تھی آصف کی اسلام کی طرف اپروچ انٹلکچوئل تھی۔

اس کے برعکس ابا سمجھتے تھے کہ حکم پرکھنے کی چیز نہیں بلکہ تعمیل کرنے کی چیز ہے۔ اور اگر ایک بار اللہ کو اکبر مان لیا جائے تو اس کے احکامات پر سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا وہ کہا کرتے تھے میاں ماننے کے لئے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلام پر آصف شرمساری محسوس کیا کرتا تھا۔ بہر حال آصف کو ابا سے ایک ہی شکایت تھی۔

جب آصف کو پتہ چلا کہ ابا پورچ کو مسجد بنا کر اور اسمیں مٹی کا لوٹا سجا کر بیٹھ گئے ہیں تو وہ سخت گھبرا گیا اس نے سوچا کہ آتے جاتے لوگ انہیں دیکھ کر سمجھیں گے کہ کوئی نیا نوکر رکھا ہے پھر وہ انہیں کیا جواب دے گا۔

ادھر بیگم صاحبہ بیٹھی تاؤ کھا رہی تھیں اگر پڑوسیوں کو پتہ چل گیا کہ یہ بچیوں کے بڑے ابا ہیں تو بات نکل جائیگی اور بچیوں کے لئے بر تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بیگم کی یہ پریشانی بھی بالکل جائز تھی۔ آج کے نوجوان کب پسند کرتے ہیں کہ وہ نماز پڑھنے والی لڑکی کو گرل فرینڈ بنائیں۔

ساحرہ ثریا بڑے ابا کی اس حرکت پر سخت ناراض تھیں۔ انہیں ان کے نماز پڑھنے پر کوئی اوبجیکشن نہ تھا۔ نماز پڑھنی ہے تو بے شک پڑھو لیکن اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے یوں باہر پورچ میں کھڑے ہوئے برسر عام سٹ سٹینڈ سٹ سٹینڈ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ وہ دونوں اسلام کے خلاف نہیں تھیں۔ اسلام بے شک ہو لیکن بے مہار نہ ہو بلکہ عقل کے تابع ہو اور ویسے بھی تو مذہب ایک پرسنل افیر ہوتا ہے۔ براڈ کاسٹ کرنے کی چیز نہیں۔

بہر حال صورت حال بڑی سنجیدہ تھی اتنی سنجیدہ کہ آصف کو شارٹ لیو پر گھر آنا پڑا۔ ان کے آتے ہی میاں بیوی ایک کمرے میں کلازٹ ہو گئے۔ کانفرنس شروع ہو گئی۔ جس طرح دفتر میں ہر پرابلم کو کاونٹر کرنے کے لئے کانفرنس ہوتی ہے۔

دونوں میں سے کوئی ابا سے یہ کہنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جناب یہاں ڈیرا نہ لگائیں ایسا کرنے سے گھر کا سٹیٹس تباہ ہو جائے گا۔ آصف چاہتا تھا کہ ڈپلومیٹک طریق کار اپنایا جائے آخر دفتر میں اتنی لمبی سروس کرنے کا کوئی فائدہ تو اٹھایا جائے۔

آصف کا خیال تھا کہ بڑے ابا نے صرف دھوپ کی خاطر وہاں ڈیرہ لگایا ہے اور بنگلے میں کسی جگہ دھوپ آتی نہیں۔ پھر اس نے حساب لگایا کہ وہاں پورچ کے رن وے پر دھوپ صرف دو گھنٹے کے لئے ہوتی ہے۔ پرابلم صرف یہ تھی کہ ان دو گھنٹوں کے دوران ابا کو کوئی ایسی مصروفیت دے دی جائے کہ وہاں بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔

اب سوچنا یہ تھا کہ ایسی کون سی مصروفیت ہو سکتی ہے جسے ابا اپنی خوشی سے اپنا لیں۔ دفعتاً بیگم کا چہرا خوشی سے تمتما اٹھا اور وہ فاتحانہ انداز سے بولیں بن گئی بات۔

پھر چار ایک منٹ کے بعد دونوں میاں بیوی باورچی خانے کے باہر کھڑے ہو کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ با آواز بلند کہ ابا سن لیں آصف بولا۔

’’بیگم آج سے گوشت پکانا بند کر دو۔‘‘

’’اے کیوں؟‘‘ بیگم مصنوعی حیرت سے چلائی

آصف نے کہا ’’نوکروں کو گوشت کی پہچان تو ہوتی نہیں۔‘‘

’’ہاں گوشت کی پہچان ہر کسی کو نہیں۔‘‘ بیگم نے کہا۔

’’بس اس کا ایک ہی حل ہے‘‘ صاحب بولا۔ ’’گوشت پکانا بند کر دو۔‘‘

’’ہئے‘‘ بیگم نے کہا ’’گوشت کی پہچان تو بڑے ابا کو ہے۔ ایسا گوشت لاتے ہیں جیسے لچی گری ہو۔‘‘

’’اونہوں خبردار۔‘‘ آصف نے اسے ڈانٹا۔ ’’ہم ابا کی خدمت کرنے کے لئے یہاں لائے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہمارے سودے ڈھوئیں۔ خبردار جو یہ بات زبان پر لائی تو۔‘‘ یہ کہہ کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد بڑے ابا داخل ہوئے ان کے کندھے پر بڑا رومال لٹک رہا تھا بولے۔

’’بہو آج سے گوشت میں خود خرید کر لایا کروں گا۔‘‘

آصف کے ماتھے پر تیوری چڑھ گئی بولا ’’نہیں ابا یہ نہیں ہو سکتا کبھی نہیں۔‘‘

’’بیٹے، بڑے ابا نے کہا ’’میں کام کرنے کا عادی ہوں یہاں نکمے پڑے رہنے کی وجہ سے میرا دل نہیں لگتا۔ میری اپنی خواہش ہے کہ میں خود گوشت خرید کے لایا کروں۔‘‘

آصف نے سر لٹکا لیا۔ ’’ابا اگر آپکی خوشی اسی میں ہے تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔‘‘ بیگم نے منہ پر رومال رکھ لیا تا کہ اس کی مسکراہٹ بھید نہ کھول دے۔ بنگلے پر ٹوٹی ہوئی قیامت ٹل گئی۔

بڑے ابا روز صبح اٹھتے ہی پرنا شانے پر ڈال کر گوشت خریدنے نکل جاتے ہیں۔ صاحب دفتر جانے لگتے ہیں اور بیگم انہیں سی آف کرنے کے لئے پورچ میں آتی ہے تو رن وے کا وہ دھوپ سے بھرا ہوا ٹکڑا انہیں اشارے کرتا ہے میری طرف دیکھو۔ مگر وہ انکھیں چرا جاتے ہیں۔ پھر گاڑی سٹارٹ ہوتی ہے اور بیگم بائی بائی کہہ کر جلدی سے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

اس وقت ایک بوڑھا مارکیٹ میں دھکے کھاتے ہوئے قصائیوں کی ڈانٹ سہتے ہوئے پھولے نہیں سماتا۔ کہ وہ اپنے کنبے کے لئے اچھا گوشت مہیا کر رہا ہے۔

نقل یا اصل

خالد امیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ ماں باپ نے اسے ایک اعلیٰ انگلش سکول میں داخل کر رکھا تھا۔ جہاں لڑکے پڑھتے بھی تھے اور رہتے بھی تھے۔ یہ سکول پہاڑوں میں ایک خوبصورت جگہ واقع تھا۔

تین طرف سبز پہاڑیاں تھیں چوتھی طرف بہت بڑا جنگل تھا۔ خالد کو نیچر سٹیڈی کا بہت شوق تھا۔ سکول میں دو دن کی چھٹیاں ہوئیں تو خالد نے سوچا کیوں نہ میں یہ دن جنگل میں گھوموں پھروں۔ اسنے ہاسٹل کے وارڈن سے اجازت لی اپنی چھوٹی بندوق اٹھائی اور جنگل میں نکل گیا۔ جنگل بہت خوبصورت تھا۔ اس میں رنگ رنگ کے پھول تھے۔ طرح طرح کے درخت تھے۔ جانور تھے۔ پرندے تھے۔

سارا دن وہ جنگل میں گھومتا رہا۔ جب شام پڑی تو اسنے سوچا اب گھر لوٹ جاؤں۔ لیکن اسے واپسی کا راستہ نہ ملا۔ تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اب کیا کروں۔ رات ہو چکی ہے۔ کہاں ٹھکانا کروں وہ پھر سے اٹھا اور رات کے ٹھکانے کیلئے جگہ ڈھونڈنے لگا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار گیا تو دفعتاً اسے ایک کھوہ نظر آئی۔ خوش قسمتی سے ٹارچ اسکی جیب میں تھی۔ اسنے ٹارچ جلائی اور کھوہ میں اتر گیا۔ دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا غار ہے۔ سوچا چلو یہیں رات بسر کرلوں گا۔ اتنے میں غار کے ایک کونے میں اسے ایک بہت بڑی لوہے کی بوتل نظر آئی۔ بڑا حیران ہوا۔ اتنی بڑی بوتل۔ وہ بوتل خالد کے قد سے بھی اونچی تھی۔ گڈ گاڈ اتنی بڑی بوتل اس غار میں کس طرح آئی۔ اور پھر لوہے کی بوتل۔

اسکے دل میں کھتر پھتر ہونے لگی۔ دیکھوں تو اس بوتل میں کیا ہے۔ خالد دو چار بڑے بڑے پتھر رکھ کر ان پر چڑھ گیا کہ بوتل کے اندر جھانک سکے۔

اسنے دیکھا کہ بوتل پر اتنا بڑا ڈھکنا لگا ہوا ہے اور ڈھکنے پر مہر لگی ہے۔

اسنے بڑی مشکل سے مہر کو توڑا اور ڈھکنا کھولا دفعتاً بہت بڑا دھماکا ہوا۔ خالد ڈر کر نیچے گر پڑا اسنے دیکھا کہ بوتل سے روشنی کی پھوار نکل رہی ہے۔ سارا غار روشن ہو گیا۔ پھر وہ روشنی سمٹنے لگی۔ اور سمٹتے سمٹتے ایک خوبصورت لڑکی بن گئی۔

خالد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''ہو یو۔''

لڑکی بولی ''میرا نام گل نار ہے۔ میں پری زادی ہوں۔ ایک جن نے مجھے اس بوتل میں قید کر رکھا تھا۔ تو نے مجھے اس قید سے چھڑایا ہے میں تیرے اس احسان کا بدلہ چکاؤنگی۔ چل میرے ساتھ۔''

لڑکی نے بڑھ کر خالد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے غار سے باہر لے آئی۔ باہر آ کر وہ ہوا میں اڑنے لگی اڑتے اڑتے وہ دونوں کوہ قاف میں جا پہنچے۔ کوہ قاف وہ پہاڑ ہے جہاں پریاں رہتی ہیں۔

جب گل نار اپنے دیس میں پہنچی تو اسکے ماں باپ بہت خوش ہوئے۔ سارے گاؤں والے انہیں مبارک باد دینے آئے۔ پھر انہوں نے رات بھر اس خوشی میں جشن منایا۔

اگلے دن گل نار کے ماں باپ نے کہا۔ اس لڑکے نے ہماری بیٹی کو قید سے چھڑایا ہے ہم اسے انعام دے کر واپس اسکے وطن چھوڑ آئیں۔ اس پر گلنار بولی نہیں ابا جان اس نے میری جان بچائی ہے میں نے منت مانی تھی کہ جو شخص مجھے قید سے چھڑائے گا میں اس سے بیاہ کروں گی اب آپ ہمارا بیاہ کر دیجئے۔

یہ سن کر بڑے بوڑھے سوچ میں پڑھ گئے سوچ سوچ کر بولے بیٹی یہ ایک انجانا لڑکا ہے پتہ نہیں کون ہے کس دیس کا رہنے والا ہے۔ اسکی پہچان کیا ہے۔ ایسے لڑکے سے ہم تیری شادی کیسے کر دیں۔

گلنار بولی چاہے یہ کوئی بھی ہے میں تو اسی سے شادی کروں گی۔ اس پر وہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ آخر ایک نے کہا اس سے پوچھ گچھ تو کرو۔

پھر ایک بوڑھے نے خالد سے پوچھا ''میاں تم کون ہو تمہاری پہچان کیا ہے۔''

خالد بولا ''سر پہچان کیا ہوتی ہے؟''

بوڑھا بولا ''ہر چیز کی پہچان ہوتی ہے، پانی کی پہچان ہے کہ وہ بہتا ہے، ہوا کی پہچان یہ ہے کہ وہ چلتی ہے، پرندے کی پہچان ہے کہ وہ اڑتا ہے، کیڑے مکوڑے کی پہچان یہ ہے کہ وہ رینگتا ہے۔

خالد نے کہا ''سر میں نہ تو برڈ ہوں نہ السکٹ ہوں میں انسان ہوں۔''

بوڑھا بولا انسان کی بھی پہچان ہوتی ہے۔ اسکے لباس کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قوم سے ہے اسکی بولی سن کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس دیس کا ہے اسکا اٹھنا بیٹھنا دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس کے دیس کی ریت کیا ہے جب وہ عبادت کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اسکا خدا کون سا ہے۔ بیٹے تو بتا تو کون ہے اور کہاں کا ہے۔

خالد بولا ''سر آئی ایم مسلم آف پاکستان۔''

یہ سن کر سارے منہ میں انگلیاں ڈال کر بیٹھ گے پھر بڑے بوڑھے الگ جا بیٹھے ایک بولا یہ لڑکا جھوٹا ہے۔ دوسرے نے کہا وہ ہم سے سچی بات چھپا رہا ہے۔ تیسرے نے کہا تم پتہ تو لگاؤ پہلے۔ ایک بولا، پتہ لگانے کی کیا ضرورت ہے اسکا جھوٹ تو سامنے نظر آ رہا ہے۔ بالکل کپڑے دیکھو تو صاف فرنگی ہے۔ نیچے پتلون ہے اوپر شرٹ ہے کوٹ ہے ٹائی ہے۔ اور بولتا بھی انگریزی ہے۔ منہ ٹیڑھا کر کے کھاتا میز پر ہے۔ بیٹھتا کرسی پر ہے۔

سب بڑے بوڑھے بولنے لگے گل نار کا باپ بولا۔ آپ سب ٹھیک کہتے ہیں یا تو یہ لڑکا فرنگی ہے اور یا اسکی نقل ہے اور جو قوم اصل نہ ہو بلکہ نقل ہو اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں سردار تمہاری کیا رائے ہے۔ اسنے سردار سے پوچھا۔ سردار جواب تک چپ بیٹھا تھا بولا ''بھائیو! ایک بات تو میں پکی جانتا ہوں وہ یہ کہ یہ لڑکا مسلمان نہیں ہے۔ چونکہ کل سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اسکے منہ پر اللہ کا نام نہیں آیا۔ نہ اسنے کسی بات پر سبحان اللہ کہا ہے نہ انشاء اللہ کہا ہے۔ نہ بسم اللہ۔ بھائیو مسلمان تو بات بات پر اپنے اللہ کا نام لیتے ہیں۔ اور یہ

لڑکا تو ''گڈ گاڈ'' گڈ گاڈ'' کرتا پھرتا ہے۔''

شاید اسکے خدا کا نام گڈ گاڈ ہو۔ ایک بڈھا بولا۔ شاید، دوسرا بولا۔ پھر یہ خود کو مسلمان کیوں کہتا ہے۔ گل نار کے باپ نے سردار سے کہا۔

سردار کیا تجھے پتہ ہے کہ مسلمان کی پہچان کیا ہے۔ سردار بولا۔ مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ مسلمان اللہ کا نام سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ بڈھے جن نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام واحد مذہب ہے جو جنوں کو مانتا ہے۔ مسلمانوں کی کتاب میں لکھا ہے کہ اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور جن کو آگ سے۔ بہرحال گل نار کے باپ نے کہا یہ لڑکا مسلمان نظر نہیں آتا۔

آخر میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار پھر خالد سے پوچھ دیکھو۔ خالد کو بلایا گیا اور اس سے پوچھ گچھ شروع ہوگئی۔

سردار بولا ''لڑکے یہ بتا کہ تیرا دیس کہاں واقعہ ہے۔''

خالد بولا ''جناب میرا ہوم لینڈ پاکستان ہے جو ہندوکش ماؤن ٹین کے نیچے واقع ہے۔ میرے دیس میں ہر طرح کا پلانٹ اُگتا ہے ہر کلر کا فلاور کھلتا ہے ہر طرح کا ویدر موجود ہے۔ زمین گولڈ اگلتی ہے۔

سردار نے کہا'' کیا وجہ ہے کہ تم اپنے ملک کا لباس نہیں پہنتے۔ اپنی بولی نہیں بولتے۔ اپنی ریت پر نہیں چلتے۔''

خالد نے کہا'' جناب اس لئے کہ ہم نے ترقی کرلی ہے میرے ہوم لینڈ میں ایسا لوگ بھی ہے جو اپنا ڈریس پہنتا ہے۔ اپنی بولی بولتا ہے۔ پرانے سسٹم کے مطابق رہتا ہے۔ لیکن وہ ان پڑھ ہے۔ اولڈ فیشنز ہے انہوں نے ترقی نہیں کی۔''

اس پر سردار کو غصہ آ گیا بولا'' شٹ اپ، یہ اچھی ترقی ہے جو تم نے اپنی اصلیت کو بھلا دیا ہے میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے شخص سے نہیں کروں گا جو اصل نہیں بلکہ نقل ہو۔''

عین اس وقت گل نار آ گئی وہ بہت غصے میں تھی بولی'' ابا جان کیا آپ کو میری

منت کا پاس نہیں میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جو مجھے قید سے رہا کرائے گا میں اسی سے شادی کروں گی۔ میں اپنے قول سے کیسے بدل سکتی ہوں۔''

گلنار کی بات سن کر وہ پھر سوچ میں پڑ گے۔ آخر میں فیصلہ ہوا کہ دو جن پاکستان بھیجے جائیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئیں کہ پاکستانی قوم نقل ہے کہ اصل۔ تین دن گزر گے لیکن جن واپس نہ آئے۔ سبھی بے صبری سے جنوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ گلنار بڑی بے چین تھی کہ دفعتاً شور مچا کہ ایک جن واپس آ گیا ہے جب وہ نیچے اترا تو بولا۔ بھائیو میں نے پاکستان جا کر دیکھا ہے وہاں تو سب فرنگی ہی فرنگی آباد ہیں۔ وہ ہر بات میں فرنگی کی نقل کرتے ہیں۔

یہ سن کر گلنار کا دل بیٹھ گیا۔ عین اس وقت دوسرا جن بھی آ پہنچا۔ آتے ہی بولا بھائیو۔ میرا ساتھی غلط کہہ رہا ہے اس نے صرف پاکستان کے شہر دیکھے ہیں میں نے اس ملک کے دیہات کو دیکھا ہے وہاں کے لوگ نقلی نہیں بلکہ اصلی ہیں انکا پہناوا مانگے کا نہیں اپنا ہے، انکی بولی اپنی ہے انکی ریت اپنی ہے ان کی ہر بات اپنی ہے اور وہ اپنے اللہ کا نام سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ واہ واہ کیا ملک ہے اور کیا لوگ ہیں۔

یہ سن کر گلنار کا دل پھول کی طرح کھل گیا۔ اسکے ماں باپ کے اندیشے دور ہو گے بڑے بوڑھے خوش ہو گئے اور سب گلنار اور خالد کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور وہ خوشی خوشی رہنے سہنے لگے۔

انوکھی گاڑی

جب گاڑی نے رفتار پکڑی تو وہ گھبرا کر چونکا بڑھ کر دروازے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ یا اللہ یہ کیسی گاڑی ہے۔ اتنی رفتار اتنی کھڑ کھڑ اتنا شور۔ یہ تو دھکے دیتی ہے۔

ہماری گاڑی تو ایسے نہیں چلتی۔ وہ سکھووال کا رہنے والا تھا۔ شہر سے دور سرسبز ٹیلوں میں گھرا ہوا اک گاؤں ہے جہاں سنہری دھوپ میں ہرے بھرے کھیت پاؤں پسارے لیٹے رہتے ہیں اور ان کے بیچ میں ایک اونگھتی ہوئی بستی ہے۔ بجائی کے وقت گاؤں والے چیونٹیوں کی طرح کام میں لگے رہتے ہیں۔ پھر درختوں کی چھاؤں تلے لیٹ کر اُگتے ہوئے پودوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ساتھ حقہ گڑ گڑ کرتا ہے۔ میدان میں بچے کھیلتے ہیں وہڑوں میں گاؤں کی عورتیں چرخہ کاتتی ہیں یا سوئی سلائی میں لگی رہتی ہیں۔

سکھووال ریل کی برانچ لائن پر واقع ہے دن میں ایک گاڑی آتی ہے۔ ایک جاتی ہے۔ اور وہ گاڑی یوں چلتی ہے جیسے بطخ پانی میں تیرتی ہے۔ ٹھیک ہے منزل پر ہی پہنچنا ہے نا پہنچ جائیں گے۔ جلدی کیا ہے۔ راستے میں یہ گاڑی نہیں رکتی۔ چلتی گاڑی سے مسافر اتر جاتے ہیں انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا صرف دھکا سا لگتا ہے یا پھر خراشیں لگتی ہیں۔ اگر کسی سے کوئی چیز گر گئی تو اسکا مالک اتر گیا چیز اٹھائی اور پھر گاڑی پر سوار ہو گیا۔

یہ گاڑی تو ہماری گاڑی نہیں اسنے سوچا پتہ نہیں میں اس پر کیسے سوار ہو گیا۔ اتنی تیز گاڑی تو میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ شکر ہے گاڑی کی اس ڈیوڑھی میں جہاں وہ کھڑا تھا کوئی دوسرا شخص نہ تھا۔ ورنہ بہت شرمندگی ہوتی۔ شرمندہ ہونے کی بات تو تھی وہ اتنی تیز سپیڈ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو پاؤں پر کھڑا بھی نہ ہو سکتا یوں

دروازے کے ہینڈل سے چمٹا ہوا تھا جیسے ڈوبتا تنکے سے۔ گھبرا کر میں نے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ باہر جھانکا تو حیران رہ گیا۔

باہر بڑی بڑی عمارتیں یوں پیچھے کو دوڑی جا رہی تھیں جیسے پیچھے پولیس لگی ہو۔ زناٹے سے آئیں اور زوں۔۔۔ سے چلی جاتیں۔ اور پھر وہ عمارتیں بھی عجیب وغریب تھیں۔ منزلیں ہی منزلیں، منارے ہی منارے، چمنیاں ہی چمنیاں دھواں نکل رہا تھا۔ منزلوں میں کھڑکیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ یوں نظر آ رہی تھیں جیسے ماچس کی ڈبیاں قطار در قطار دھری ہوں۔ ماچسوں کے یہ ڈھیر اتنے اونچے تھے کہ آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر ان پر بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ جن پر بڑے بڑے رنگین انگریزی حروف میں لمبے لمبے نام لکھے ہوئے تھے۔ وہ تو شکر ہے کہ گاؤں کے مدرسے سے میں نے مڈل پاس کر رکھا ہے ورنہ مجھے ان ناموں کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا۔

وہ عمارتیں طرح طرح کی تھیں۔ کوئی کارخانہ تھا کوئی مل تھی۔ کوئی تحقیقی ادارہ تھا۔ کوئی لبارٹری تھی۔ کوئی لائبریری تھی۔ کوئی کچھ کوئی کچھ۔ اتنی عمارتیں۔ دیکھ کر رعب پڑ جاتا میں تو گھبرا گیا۔ سوچا چلو کسی ڈبے میں جا کر بیٹھوں۔ ایسی سیٹ پر جہاں کھڑکی ہو۔ بیٹھ کر مناظر دیکھنے میں لطف آئے گا۔

ارے، اس ڈیوڑھی میں تو کوئی دروازہ ہی نہیں تھا۔ یہ کیسی گاڑی ہے جس میں ڈبوں میں جانے کے لئے کوئی دروازہ ہی نہیں۔ اب میں کیا کروں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈیوڑھی کی دوسری طرف ایک بیرا وردی پہنے ہاتھوں میں برتنوں بھرا ٹرے اٹھائے آ نمودار ہوا۔ بیرے نے اسے دیکھا اور رک گیا۔ غور سے اسکا جائزہ لیا آنکھوں میں اک تحقیر سی لہرائی پھر وہ چل کر اسکے پاس آ گیا۔

''کون صاحب ہو تم؟'' اُسنے پوچھا۔

وہ گھبرا گیا ''میں کوئی بھی نہیں ہوں، کوئی بھی نہیں۔''

اُسکے ہونٹ تحقر سے کھل گئے۔ ''تم اس گاڑی میں کیوں آ گیا؟''

''مجھے سکھووال جانا تھا۔''

''سکھووال کون ہے تیرا؟''

''میں وہاں رہتا ہوں، مجھے عوام کہتے ہیں۔''

دفعتاً بیرے کا رویہ بدل گیا۔ ''اوہ یہ تو بڑی مشکل ہوئی یہاں کسی عوام کو آنے کی اجازت نہیں۔ پھر بولا ''میں بھی ادھر کا رہنے والا ہوں۔''

''سچ'' وہ بولا ''کہاں کا؟''

''غریب آباد کا۔''

''اچھا وہ سکھووال سے ۸ کوس پر ہے۔''

''ہاں وہی۔''

عوام ''تُو ادھر کیسے آ گیا؟''

''میں صاحبوں کا بیرا ہوں۔ اس گاڑی میں انہیں نہیں پتہ کہ میں بھی ذات کا عوام ہوں۔ ورنہ وہ مجھے ادھر آنے ہی نہ دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں میں بیرا ہوں۔''

''اچھا'' وہ مسکرایا۔ ''عوام کے نمائندے، وہ کیا ہوتا ہے۔ نمائندہ، وہ جو عوام کے حقوق کے لئے لڑے۔''

''اچھا وہ بولا، ہمارے بھی حقوق ہوتے ہیں کیا؟''

'' ہوتے ہیں۔'' بیرے نے سرگوشی میں کہا۔'' ہم نہیں جانتے، ہمارے نمائندے جانتے ہیں۔''

''ہاں ضرور جانتے ہونگے شہروں میں رہتے ہیں نا۔ شہروں میں رہنے والے بہت سیانے ہوتے ہیں۔''

''ہونہہ سیانے، بیرے نے ناک بھوں چڑہائی۔ تو کیا ساری گاڑی میں ہمارے ہمائندے ہی ہیں۔ اس گاڑی میں بہت سے لوگ ہیں۔ عوام کے نمائندے، عوام کے خادم، بڑے بڑے سائنس دان، عالم، صحافی، ادیب، کارخانے دار، تاجر، ٹیکنالوجی والے۔''

"اتنے سارے لوگ۔"

"ہاں" وہ بولا۔

"تو پھر میں کیا کروں۔ کہیں رکے تو اتر جاؤں۔"

"اونہوں یہ گاڑی رک نہیں سکتی۔ اسکے چلتے رہنے میں زندگی ہے رک جائے تو موت۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ گاڑی سائیکل کی طرح ہے سائیکل رک سکتا ہے کیا۔"

"نہیں۔"

"بس پھر۔"

"اچھا دیکھو میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں۔"

"پاگل ہوگیا ہے کیا۔ تیری تو ہڈی پسلی ایک ہوجائے گی۔"

"ہماری گاڑی سے تو مسافر چھلانگ لگا دیتے ہیں بس خراشیں آتی ہیں۔"

"اونہوں یہ گاڑی اتنی رفتار سے چل رہی ہے کہ جو تو باہر کودے گا تو تیرا قیمہ ہو جائے گا۔"

"بھئی یہ ڈویلپمنٹ ایکسپرس ہے۔"

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"ڈویلپمنٹ، مطلب ہے ترقی۔"

"مجھے کیا پتہ کہ ترقی کیا ہوتی ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ فصل زیادہ ہو پیٹ بھر کر روٹی کھائیں لسی پینے کو ہو۔ زمیندار کے حواری بے عزت نہ کریں۔ اپنے آرام سے اللہ اللہ کریں۔"

بیرا ہنسا بولا "میں بھی یہی سمجھا کرتا تھا۔ اب یہاں آ کر پتہ چلا کہ ترقی کسے کہتے ہیں۔ تم نہیں جانتے ترقی کو۔"

"ہوگی بھائی ہمیں کیا لینا دینا اس سے۔ مجھے یہ بتا کہ میں کیا کروں اب؟"

"بڑی مشکل ہے"، بیرا سوچ میں پڑ گیا "اگر انہیں پتہ چلا کہ گاڑی میں عوام گھس آیا ہے تو وہ تجھے باہر دھکا دے دیں گے اور تیرا قیمہ ہو جائے گا۔ دیکھ وہ بولا "میں تجھے ایک پاس لا دیتا ہوں۔ تو اسے کرتے پر لگا لے۔ پھر وہ تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ اور اگر انہوں نے پوچھ لیا کہ تُو کون ہے تو تُو یہ نہ بتانا کہ میں عوام ہوں۔ یہاں عوام نہیں آ سکتے۔ انکے نمائندے آ سکتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے یہ۔"

"شہر والوں کی ساری باتیں عجیب ہوتی ہیں۔"

"ہاں بھئی۔" اسنے سر ہلا کر کہا۔ "وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں ہم سے بہتر جانتے ہیں۔"

"تو یہیں کھڑا رہ۔" بیرا بولا "میں پاس لاتا ہوں۔" یہ کہکر بیرا تیزی سے چلا گیا اور وہ اکیلا رہ گیا۔ انتظار میں وہاں کھڑے اسے یوں لگا جیسے ہفتے گزر گئے ہوں۔ اسکا دل سہما ہوا تھا۔ پتہ نہیں اب کیا ہوگا بیرا آئے گا بھی یا نہیں۔ آخر بیرا آ گیا اسنے آتے ہی جیب سے ایک سبز رنگ کا کارڈ نکالا۔ اور سنہرے پن سے اسے عوام کے کرتے پر لگا دیا۔ کہنے لگا "اب تم یہاں نہ رکو۔ ورنہ انہیں شک پڑ جائے گا۔ اس گاڑی میں چھ ڈبے ہیں ایک ڈبہ جو بند ہے اسکے اندر کوئی نہیں جا سکتا باقی پانچ ڈبے کھلے ہیں تم ان میں گھومو پھرو وہاں لوگ ہونگے نقشے ہونگے۔ کتابیں ہونگی۔ کمپیوٹر ہونگے۔ تصویریں ہونگی۔ وہاں بے جھجک گھومنا بیٹھ نہ جانا۔ ہر چیز کو دیکھنا۔ غور سے دیکھنا۔"

"میں کیا سمجھونگا ان چیزوں کو۔"

"نمائندے کیلئے سمجھنا ضروری نہیں۔ دیکھتے نظر آنا ضروری ہے۔ لوگوں کی باتیں سننا خود بات نہ کرنا۔ کوئی کچھ پوچھے تو جواب نہ دینا خالی مسکرا دینا۔"

"مسکرانے سے کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مسکرانے کا مطلب ہوتا ہے کہ ہم سب جانتے ہیں لیکن بتائیں گے نہیں۔"

''ہمارے ہاں تو مسکرانے کا مطلب خوشی ہوتی ہے۔''

''وہاں کی بات اور ہے یہاں کی اور۔ یہاں خوشی غمی نہیں چلتی ہے سمجھے۔''

''ہمارے ہاں بھی تو بڑے بوڑھے سیانے ہوتے ہیں۔''

بیرا چڑ گیا بولا'' وہ سیانف اور چیز ہے یہاں کی سیانف اور ہے۔ اب تو یہاں کھڑا ہو کر باتیں نہ بنا بلکہ اندر جا کر گھوم پھر۔''

وہ چل پڑا تو بیرے نے اسے پھر پکڑ لیا بولا'' یوں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح نہ چل۔ ذرا اکڑ کے شانے اٹھا کے چھاتی پھیلا کے، جیسے سب کچھ جانتا ہے سمجھتا ہے۔ اور اگر کوئی مشکل پڑے تو کمرے کے بیرے سے کہنا۔ بیرا نمبر ۹ کو بلاؤ۔ میرا نمبر ۹ ہے۔ اب تم چلو۔ یہاں نہ رکے رہو۔''

بیرا جانے لگا تو اسنے اسے پکڑ لیا۔ بولا۔'' کیا میں زندگی بھر اس گاڑی سے نہیں اتر سکوں گا۔''

''نہیں نہیں۔'' بیرا بولا'' جب بھی گاڑی رکے گی تو تم اتر جانا۔''

''لیکن تم تو کہتے ہو یہ گاڑی رکتی ہی نہیں۔''

''واقعی نہیں رکتی لیکن جب کسی بڑی آدمی نے اترنا یا داخل ہونا ہوتا ہے تو مجبوراً رکنا پڑتا ہے۔ رکے تو تُو فوراً اتر جانا۔''

''اندر جانے کا راستہ کون سا ہے۔'' اسنے پوچھا۔

''ادھر کاریڈار ہے۔'' سارا برآمدہ روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اسنے ڈبے کی طرف دیکھا۔ ارے وہ تو حیران رہ گیا۔ وہ عام ڈبوں کی طرح نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑا کمرا تھا جسکے درمیان میں ایک لمبا سا میز تھا۔ میز پر چھوٹی چھوٹی مشینیں رکھی ہوتی تھیں۔ یہاں وہاں عجیب سے نقشے پڑے تھے۔ کاغذ کتابیں۔ اوزار شیشیاں نلکیاں اور جانے کیا کیا۔ اسکے گرد یہاں وہاں چھوٹے چھوٹے میز تھے جنکے گرد صوفے لگے ہوئے تھے۔ میزوں پر چائے دانیاں پیالیاں پلیٹیں سگریٹ تھے۔ فون پر لوگ بیٹھے تھے۔ جو سگریٹ

چائے پی رہے تھے۔ اور ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہے تھے۔ کچھ لوگ میز کے گرد بحث میں مصروف تھے کچھ دیواروں پر ٹنگے ہوئے نیلے نقشوں کے اردگرد گفتگو میں مصروف تھے۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔ اور کمرے میں پڑی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

اس کے چاروں طرف لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بحثیں کر رہے تھے۔ انکی باتوں میں شدت تھی۔ آوازوں میں خود شتائی تھی۔

غالباً وہ سب سائنس دان تھے۔ ہر کوئی اپنی کامیابی کا ڈھول پیٹ رہا تھا۔ انکی گفتگو میں بار بار عوام کا ذکر آتا تھا۔ غالباً وہ سب اس خوش فہمی میں تھے کہ وہ عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ دفعتاً وہ چونکا۔ کمرے میں بہت سے آدمی ایسے تھے جو نہ تو باتیں کر رہے تھے۔ اور نہ گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ سب کمرے میں یہاں وہاں اکیلے کھڑے تھے۔ جب بھی کوئی خصوصی بات کرتا تو انکے کان کھڑے ہو جاتے۔ ظاہر تھا کہ انکی تمام تر توجہ سننے پر مرکوز تھی۔

بارہا ایسا ہوتا تھا کہ باتیں کرنے والے بولتے بولتے دفعتاً چپ ہو جاتے جیسے انہیں کوئی بھولی بات یاد آ گئی۔ پھر وہ سننے والوں کو غور سے دیکھتے۔ اور پھر اپنی بات کا زاویہ بدل کر پھر سے بات کرنا شروع کر دیتے۔

سکھووال کے اس ادھیڑ عمر عوام کو انکی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اونچی باتیں کر رہے ہیں۔ اتنی اونچی کہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ لیکن ان کا بار بار رک کر سننے والوں کی طرف دیکھ کر گھبرانا اس امر کا شاہد تھا کہ ان کے دلوں میں خوف کی ایک لہر دبی ہوئی ہے خوف کی وہ لہر سارے کمرے میں یوں دبی دبی تھی جیسے روئی کے ڈھیر میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ یا جیسے سمندر کے پانی میں نمک۔

دفعتاً وہ چونکا۔ اسکے روبرو سننے والوں میں سے ایک کھڑا تھا۔ اسنے چھاتی اکڑا لی۔ اسطرح کہ کرتے پر لگا ہوا سبز بیج وضاحت سے دکھائی دے۔ سننے والے نے بڑے غور سے بلے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسری ساعت میں وہ

پھر آگے بڑھا بولا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون صاحب ہیں۔''

''میں'' وہ بولا۔ ''میں نمائندہ ہوں۔''

''کس سیکٹر کے نمائندے ہو؟'' اُسنے پوچھا۔ وہ گھبرا گیا پھر اُسے بیرے کی بات یاد آئی کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مسکرا دینا۔ سیانی مسکراہٹ، میں سب جانتا ہوں لیکن بتانا ضروری نہیں سمجھتا اسنے مسکرا کر پوچھنے والے کی طرف دیکھا۔ عین اس وقت کوئی چلایا وہ دیکھو ہماری آبزرویٹری جہاں سے ہم مشتری کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وہاں حالات سازگار نہیں اس لئے مخلوق کا ہونا عین ممکن ہے۔ وہ سامنے۔

سب کی نگاہیں سامنے عظیم الشان عمارت کی طرف مبذول ہوگئی جو سنگ سرخ سے بنی ہوئی تھی۔ اور اسکی چھت سے بڑی بڑی جناتی دوربینوں کی نالیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سب کی نگاہیں اس طرف منعطف ہوگئی۔ انہیں یوں مصروف دیکھ کر عوام چپکے سے باہر نکل گیا۔ اور پھر ٹہلتے ٹہلتے دوسرے ڈبے میں داخل ہوا۔ دوسرے ڈبے میں ایک کونے میں جرنلسٹ بیٹھے تھے۔ وہ سب کسی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا فرانسیسی وفد ضد کر رہا ہے کہ وہ خود عوام سے ملیں گے۔

''کیا مطلب۔''

''مطلب یہ کہ خود گاؤں میں جا کر لوگوں سے ملیں گے۔ ان سے پوچھ گچھ کریں گے کہ انکے مسائل کیا ہیں۔''

''نانسنس'' دوسرا بولا۔ ''عوام کو کیا پتہ کہ انکے مسائل کیا ہیں۔ انکی مشکلات کیا ہیں۔ ہم سے پوچھیں ہم ان کے نمائندے ہیں۔''

''بھئی، تیسرا بولا'' ہم بڑی مشکل سے عوام کو مسائل اور حقوق کا شعور دلا رہے ہیں۔''

''بالکل بالکل'' دوسرے نے کہا۔ دفعتاً انہوں نے سکھو والیہ کو دیکھا۔

''آپ کون ہیں صاحب؟'' اسنے پوچھا۔

''میں نمائندہ ہوں۔'' سکھو والیہ بولا۔

''آپ سیاست میں نہیں کیا۔'' تیسرے نے پوچھا۔ اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

''اگر آپ عوام کے نمائندے ہیں تو ظاہر ہے کہ یا آپ سیانے ہیں اور یا صحافی ہیں۔''

اسنے پھر سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نمائندہ ہوں۔'' وہ بولا۔ اور ساتھ ہی سیانی مسکراہٹ داغ دی۔

''اوہ، اور وہ صحافی گھبرا گئے۔

''یعنی آپ۔''

یہ دیکھ کر دور کھڑا اسننے والا انکی طرف بڑھا۔ سکھو والیہ تیزی سے وہاں سے سرک گیا۔

اور کنڈی ہلتی رہی

چراون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دروازے کی آواز سن کر وہ اچھلا۔ مڑ کر دیکھا۔ اسکا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آنکھیں گویا اپنے خانوں سے باہر نکل آئی تھیں۔

اس نے کمرے کا غور سے جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر بھاگ کر دروازے کی طرف گیا دروازے کی کنڈی بدستور لگی ہوئی تھی۔

دن میں وہ کئی بار دروازے کی کنڈی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے بے اختیار اس کی نظر دروازے کی کنڈی پر جا پڑتی۔ کنڈی بند ہوتی لیکن بند کنڈی کو دیکھ کر بھی اسے یقین نہ آتا کہ وہ بند ہے۔

ہلکی سے ہلکی آہٹ پر بھی وہ چونک کر کنڈی کی طرف دیکھتا۔ یوں لگتا جیسے بند کنڈی ڈوبتے کے لئے تنکا ہو۔

پتہ نہیں کیوں جب تک کنڈی بند تھی وہ خود کو بیرونی شر سے محفوظ سمجھتا تھا شر اور خیر کے درمیان وہ بند دروازہ واحد رکاوٹ تھی۔ بند کنڈی اسکے لئے خیر تھی۔ سکیورٹی کا احساس تھی اس کے باوجود یقین نہیں آتا تھا کہ کنڈی بند ہے۔ اسلئے ہر آہٹ پر اسکی نگائیں کنڈی کی طرف منعطف ہو جاتیں تھیں۔ بند کنڈی کو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا کہ وہ بند ہے وہ اٹھ کر دروازے پر جاتا اور کنڈی پر ہاتھ پھیرتا۔ اسے محسوس کرتا کہ بند ہے پھر کچھ اطمینان سا پیدا ہوتا لیکن جلدی پھر دل میں شک بیدار ہو جاتا کوئی اسکے دل کے گھڑے میں منہ ڈال کر سرگوشی کرتا کیا واقعی کنڈی بند ہے۔ شاید پھر وہ شاید اسکے جسم کی نس نس میں گونجتا، شاید، شاید، شاید۔

کمرے کا جائزہ لینے اور بند کنڈی کو محسوس کرنے کے بعد وہ پھر سے کھڑکی میں

جا بیٹھتا۔ یہ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ لیکن نہیں۔ کھڑکی ہونے کے باوجود وہ کھڑکی نہ تھی۔ کھڑکی تو وہ ہوتی ہے جو کھل سکے۔ یہ کھڑکی تو سالہا سال سے بند تھی اور اس میں کھلنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ کھڑکی کھڑکی نہ رہی تھی بلکہ شیشوں کا فریم تھا۔ اور پھر وہ شیشے بھی تو شیشے نہ رہے تھے شیشہ تو وہ ہوتا ہے جس سے آر پار دیکھا جا سکے ان شیشوں پر پیلے پینٹ کے پتہ نہیں کتنے موٹے کوٹ ہو چکے تھے۔ کئی ایک کوٹ تو اسنے اپنے ہاتھوں سے کیے تھے اسکے باوجود اسے دھڑکا لگا رہتا کہ شاید باہر والے اسے دیکھ رہے ہیں۔ اسکی ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں جب یہ دھڑکا شدت اختیار کر لیتا تو وہ شیشے پیلے پینٹ کا ایک اور موٹا کوٹ چڑھا دیتا۔

شیشے میں ایک چھوٹی سی گول جگہ تھی جو التزاماً پینٹ سے خالی رکھی گئی تھی عین آنکھ کے برابر۔ جس پر آنکھ لگا کر باہر سڑک کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ شیشے کے اس ننگے دائرے کی حیثیت یوں تھی جیسے قبائلی گاؤں میں دیدبان کی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ دیدبان ظاہر ہوتا ہے یہ دیدبان مخفی تھا جو گاؤں کے درمیان ایک مینار کی شکل میں ابھرا ہوتا ہے اور جس پر چڑھ کر گاؤں کے رکھوالے دشمن کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھتے ہیں۔

اس کا زندگی میں صرف ایک مشغلہ تھا کہ اس دیدبان سے آنکھ لگا کر باہر کی طرف دیکھتا رہے باہر کا منظر اسکے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ باہر دیکھتا تو ڈر کے مارے اسکا دل دھک کرنے لگتا۔ گلے میں اک گولا سا آ کر اٹک جاتا۔ سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ خوف کی وجہ سے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے بند بند میں دھنکی سی بجتی۔ دل کسی ان جانی بلوہی میں بلوہا جاتا۔ وہ باہر سے خائف تھا اور اسی وجہ سے باہر دیکھنے پر مجبور تھا سارا سارا دن وہ کھڑکی میں بیٹھا باہر دیکھتا رہتا۔ یوں جیسے ہم سینما ہال میں Lover کی فلم دیکھتے ہیں۔

دیوار پر ہلکی سی دستک سن کر وہ پھر چونکا کمرے کا جائزہ لیا۔ کنڈی کو دیکھا۔ اور پھر کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد کسی نے پھر سے دیوار کو انگلی سے ایک مخصوص انداز سے بجایا۔

اطمینان سا محسوس کرنے کے بعد اسے ملحقہ غسلخانے کا دروازہ کھولا۔ دیوار پر ٹنگے ہوتے تولئے کو سرکایا۔ اسکے پیچھے ایک روشن دان تھا۔ اس نے روشن دان کی چٹخنی کھولی۔ کون ہے اسنے پوچھا۔

آغا میں ہوں۔ میں۔ گاما

کیا بات ہے گامے

میں آ جاؤں

آغا نے تھوڑی سی دیر توقف کیا جیسے ہچکچا رہا ہو پھر بولا۔ آ جاؤ۔ لیکن کنڈی لگا دینا۔ ضرور۔ لگا دونگا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی گامے کی نگاہیں دیدبان پر مرکوز ہو گئیں باہر کیا خبر ہے اسنے آغا سے پوچھا۔ کچھ بھی نہیں کوئی نئی بات اونہوں کیا ابھی تک نیلا سفید زرد ویسا ہی ہے۔ آغا نے آہ بھری۔ کوئی فرق نہیں کیا۔ اونہوں کوئی نہیں۔ موڈ کیسا ہے؟ گامے آہستہ بولو۔ آغا نے گامے کو گھورا۔ اوہ۔ میں بھول جاتا ہوں رضا نے سرگوشی کی۔ پتہ نہیں لوگ کیسے بھول جاتے ہیں آغا نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ مسکرا رہے ہیں یا گھور رہے ہیں۔ صبح مسکرا رہے تھے اب کا پتہ نہیں۔ ہاں گامے نے آہ بھری۔ ان کا کیا پتہ کب مسکرانا چھوڑ کر گھورنا شروع کر دیں۔ میں دیکھوں گامے نے للچائی نظروں سے دیدبان کی طرف دیکھا۔ دیکھ لو۔

گاما دوڑ کر دیدبان سے چمٹ گیا۔ یوں جیسے بھوکا بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہے۔ دیر تک وہ دیدبان سے چمٹا رہا۔ پھر دفعتاً وہ مڑا۔ سن رہے ہو تم۔ آغا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اسکے چہرے پر پھر سے خوف کا تناؤ ابھرا۔ وہ اعلان کر رہے ہیں گامانے دیدبان میں آنکھ ٹھونک کر کہا۔ کیا اعلان۔ آغا کے چہرے پر امید کی کرن لہرائی۔ نیلی ٹوپی والے مردار ہو گئے اب سفید کرتے والے آ گئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں اب ہر ایک سے انصاف کیا جائے گا کھڑکیاں کھول دوں نہ نہ وہ چلایا کہیں کھڑکی نہ کھول دینا۔

کیوں؟

یہ اعلان تو میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں ہر آنے والا یہی اعلان کرتا ہے کالے دن ختم ہوئے گھٹن دور ہوگئی دھواں چھٹ گیا اب گیس جلائے جائیں گے کونے کونے میں روشنی پہنچائی جائے گی کسی کے ذہن میں اتنی بات نہیں کہ وہ اپنی بات کرے۔ تو کیا کھڑکیاں نہیں کھلیں گی۔

پہلے کھلا کرتی تھیں۔ آغا نے سرگوشی کی۔ اب لوگ اس علان سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور اب تو ہم کھڑکیاں کھولنا چاہیں بھی تو نہیں کھول سکتے۔ شاید وہ سچ کہہ رہے ہوں۔

سچ آغا نے آہ بھری۔ اب تو انہیں پہچان ہی نہیں رہی کہ سچ کیا ہوتا ہے۔ اب تو سچ بھی جھوٹ ہی نظر آتا ہے۔

شاید وہ اپنی طرف سے سچ بول رہے ہوں۔ اونہوں آغا نے سرنفی میں ہلایا۔ سچ بولنے کی چیز نہیں کرنے کی چیز ہے۔ اچھا۔ گاما سوچ میں پڑ گیا۔ اس طرح تو کسی پر اعتماد پیدا نہیں ہوگا۔

اعتماد آغا نے آہ بھری اور چپ ہوگیا۔ دیر تک وہ خاموش رہا پھر اسنے سر اٹھایا۔ چاروں طرف بے اعتمادی کی دھول اڑ رہی تھی۔ سانس لینا مشکل ہے اتنی بے اعتمادی ہے کہ ہمیں خود پر اعتماد نہیں رہا۔ اپنی نگاہوں پر اعتماد نہیں رہا۔ کانوں پر اعتماد نہیں رہا۔ سوچ پر محسوسات پر اعتماد نہیں رہا۔ وہ خاموش ہوگیا۔

ہاں ہوگا، آغا نے گویا خود سے کہا۔

کس پر؟ گاما نے پوچھا۔ وہاں کس پر۔ وہ گاما خود سے باتیں کرنے لگا اس پر جو بولے گا سچ نہیں بولے گا۔ جو بولے گا ہی نہیں صرف کر دکھائے گا ان سب نے بول بول کر بول کو دو کوڑی کا کر دیا۔ توبہ توبہ آغا نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اتنا بولتے ہیں سر اتنا بولتے ہیں گذشتہ اتنے سارے سالوں سے یہ مسلسل بول رہے ہیں بولے جا رہے ہیں ساری فضا انکے بولوں سے بھری ہوئی ہے۔ خالی خولی بول۔ سن سن کے ہمارے کان پک گے۔ وہ

خاموش ہوگیا۔

سچ کہتے ہیں گاما نے کہا اور دیدبان میں آنکھ لگا کر بیٹھ گیا کمرے پر ایک بھیانک خاموشی چھاگئی۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر دفعتاً دیوار پر پھر دستک کی آواز آئی۔ آواز سن کر آغا چونکا۔ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اسکا چہرا خوف سے بدنما ہوگیا۔

یہ کون تھا۔ اسنے سرگوشی میں پوچھا۔ دیوار پر پھر دستک ہوئی۔ ارے اس نے لپک کر گاما کو جھنجھوڑا! سن رہے ہو تم۔ یہ آواز۔ یہ تمہارے کمرے سے آرہی ہے۔ میرے کمرے سے؟

ہاں ضرور تمہارے کمرے میں کوئی ہے۔ میرے کمرے میں۔ ہاں میرے کمرے میں ہے۔

کون ہے، وہ تو پیلی ہے۔

پیلی؟ پیلی کون ہے۔ وہ۔ وہ لڑکی ہے لڑکی۔ ضرور وہ سپاہی ہوگی۔ باہر والوں نے اسے بھیجا ہوگا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ نہیں نہیں گاما چلایا۔ وہ تو اندر والی ہے۔ تمہیں کیسے پتہ ہے۔ اسکے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ وہ اندر والی ہے۔ بے وقوف آغا چلایا۔ لڑکیوں کے چہرے پر تو نہ اندر لکھا ہوتا ہے نہ باہر۔ صرف ایک چیز صرف ایک وہ کیا۔

اسکے چہرے پر صرف لڑکی لکھا ہوتا ہے۔ میں لڑکی ہوں۔ بس اور کچھ نہیں تم اسے دیکھو گے تو میری بات مان لو گے کہ وہ اندر والی ہے۔

دیوار پر پھر دستک ہوئی۔ گاما میں آجاؤں دور چاندی کی گھنٹی بجی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو دفعتاً جیسے کچھ ہوگیا پتہ نہیں کیا ہوا۔ مگر ہوا۔ جیسے کمرے کا جغرافیہ بدل گیا ہو۔ آب و ہوا بدل گئی ہو۔ کمرے کے کونوں میں دبکا ہوا خوف جیسے تحلیل ہو گیا ہو۔ دروازے کی کنڈی موٹی اور مضبوط ہوگئی ہو۔ گھٹن میں تخفیف ہوگئی آغا نے غور سے نو وارد کی طرف دیکھا۔ اسکے چہرے پر ہلدی کا موٹا کوٹ چڑھا ہوا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کھڑکی پر پیلے پینٹ کا کوٹ چڑھا ہوا تھا۔ پیلی کے چہرے پر گالوں کی جگہ ہڈیاں ابھری

ہوئی تھیں۔ آنکھیں یوں پیچھے دبکی ہوئی تھیں جیسے شست لگائے بیٹھی ہوں۔ جسم پنکھی کی طرح ڈول رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ہڈیوں کے اس پنجر میں ایک بے نام ہیبت تھی۔

یہ آغا ہے؟ اسنے گاما سے پوچھا۔ گاما نے سر ہلا دیا۔

تم کون ہو؟ آغا نے پوچھا۔

میں پیلی ہوں۔

تم گامے کے پاس کیوں آئی ہو؟

میں، میں اکیلی تھی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

کیا پتہ تمہیں باہر والوں نے بھیجا ہو۔ کیا پتہ تم ہمارا بھید لینے آئی ہو۔

کیسا بھید؟ وہ بولی۔

ہم اندر والوں کا بھید۔

اندر والوں کا کیا بھید ہے؟ وہ مسکرائی۔ تمہارے پلے کوئی بھید ہے کیا۔ سارا بھید تو باہر والوں کے پاس ہے۔ ہم اندر والوں کا تو صرف ایک بھید ہے وہ یہ کہ ہم سہمے بیٹھے ہیں۔ بس۔ اور یہ بھید تو سبھی جانتے ہیں۔ سبھی۔ وہ بھید کیسا جسے سبھی جانتے ہوں۔

آغا خاموش ہو گیا۔ کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ پھر دفعتاً بولا مجھے تم پر شک ہے۔

کیسا شک؟

کہ تم ہم میں سے نہیں ہو۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں کھل گئے۔

تم مخول کر رہے ہو۔ وہ بولی۔ تمیں شک کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ شک تو باہر والوں کا وصف ہے۔ باہر والوں کا۔ گاما نے حیرت سے پیلی کی طرف دیکھا۔ انہیں اپنے آپ پر شک ہے۔ اپنے ساتھیوں پر شک ہے۔ اندر والوں پر شک ہے۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو انہیں شک ہوتا ہے کہ کوئی ہماری بات کر رہا ہے۔ جب وہ بات سنتے ہیں تو شک پڑتا ہے کہ کوئی ہم سے سچی بات نہیں کرے گا۔ جب وہ دعوی کرتے ہیں تو شک ہوتا ہے کہ وہ کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ وعدے کرتے ہیں تو شک کرتے ہیں کہ کبھی ایفا نہیں ہونگے۔ شک تو وہ کرتے

ہیں جنکے بازو میں طاقت ہو۔ لیکن دل میں چور ہو۔

خاموش خاموش گامے نے پیلی کو گھورا۔ وہ، وہ علان کر رہے ہیں وہ دیدبان کی طرف لپکا۔

میں بھی دیکھوں گی میں بھی دیکھوں گی۔ پیلی چلائی اور دیدبان کی طرف دوڑی۔

آغا چپ چاپ موڑھے پر بیٹھا سوچتا رہا سوچتا رہا۔

انوالومنٹ

اس روز بیگم جاہ کا جی اچھا نہ تھا۔ طبعیت بوجھل تھی۔ چکر آ رہے تھے۔ وہ سر شام ہی بیڈروم میں جا کر لیٹ گئی۔

بڑی دیر وہ تکیوں میں سر دے کر لیٹی رہی۔ لیکن بند آنکھوں کے سوا نیند کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔ دو ایک گھنٹے پڑے رہنے کے بعد اٹھ بیٹھی۔ گھڑی کی طرف دیکھا ساڑھے نو بجے تھے۔

دفعتاً اُسے یاد آیا، ''دس بجے۔''

او کہیں اس لئے تو نیند نہیں آ رہی تھی کہ ابھی دس نہیں بجے۔ نہیں نہیں۔ وہ چلائی۔ میں کیا ٹین ایجر ہوں جو تاک جھانک میں دلچسپی لوں۔ وہ سٹوپڈ تو بالکل ہی بچہ ہے جو اس قسم کا بے ہودہ مطالبہ کرتا ہے۔ لو کوئی بات ہے کہ روز رات کے دس بجے کھڑکی کھول کر بتی جلا کر کھڑی ہو جاؤں تا کہ وہ کوٹھی کے عقبی ٹیلے سے ایک نظر مجھے دیکھ سکے۔ بھلا یوں دس گز کے فاصلے سے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ توبہ انوالومنٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔ کہتا ہے نہ دیکھوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔

غصے کے باوجود بیگم جاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ دیکھوں تو، اُس نے سوچا۔ کہیں وہ ابھی سے تو نہیں کھڑا۔ وہ اٹھ بیٹھی کمرے کی بتی جلائے بغیر عقبی کھڑکی کے شیشے سے جھانکنے لگی۔

بجلی کے کھمبے تلے ٹیلے پر کوئی کھڑا تھا۔ ارے وہ چلائی۔ وہ تو کھڑا ہے، ہاں وہی تو ہے۔ وہی بھرا ہوا گول چہرہ، کنڈل والے بال اور میرے بیڈروم کی کھڑکی کو اسی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔

لو بھلا روز رات کے دس بجے یہاں آ کر ایک نظر مجھے دیکھنے کی آس لگائے کھڑے رہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میکنگ اے فول آف ہم سیلف، سٹوپڈ۔

بیگم کو خوش بخت کی حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ ساتھ ہی ہنسی بھی آ رہی تھی۔ نہیں نہیں، آج میں بتی جلا کر سامنے کھڑی نہیں ہوں گی۔ بہت ہو لیا، چار روز یہ حماقت کر دیکھی۔ اب نہیں، بالکل نہیں۔ اس نے غصے میں کہا، بالکل نہیں۔

بیگم جاہ کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں بھی بیوقوف ہوں جو چار روز سے ایسے سلی مطالبے کو انکریج کر رہی ہوں۔ کھڑا رہے چاہے ساری رات میں بجلی جلا کر کھڑکی میں کھڑی نہیں ہوں گی۔

وہ پھر سے تکیوں میں سر دے کر لیٹ گئی۔ بہت کر لیا ترس۔ اس نے سوچا۔ اور پھر کھڑا کس انداز سے ہے۔ شکستگی، سپردگی اور بے بسی کی انتہا ہو رہی ہے۔ توبہ سپردگی کا جذبہ طاری ہو جائے تو انسان بالکل ہی (Depersonalise) ہو جاتا ہے۔ کانوں سمیت احمق نظر آنے لگتا ہے۔ بیگم نے جھرجھری لی۔ اللہ بچائے، اس کے ہونٹ حقارت سے سمٹے۔ ساتھ ہی دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ جی چاہا کہ اٹھ کر ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھے۔ کہیں اس کی اپنی پرسنیلٹی ماند تو نہیں پڑ گئی۔ دم خم موجود ہے کہ نہیں۔ بیگم اپنی پرسنیلٹی کے متعلق فکرمند کیوں نہ ہوتی۔ اسی کے بل بوتے پر تو وہ اونچے حلقوں میں محبوب بنی تھی۔ بیگم بنی تھی۔ وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جب بیگم میں خالی پرسنیلٹی ہی پرسنیلٹی رہ جاتی ہے۔ شہد چو جاتا ہے صرف موم کھگا باقی رہ جاتا ہے۔

بیگم جاہ کی پرسنیلٹی اللہ کی دین نہ تھی جو بن مانگے ملتی ہے۔ اس نے زندگی بھر مسلسل محنت سے ایک ایک اینٹ چن کر اپنی پرسنیلٹی کا بوالہول تعمیر کیا تھا۔

جب اس کی شادی ہوئی تھی تو وہ خالی خولی نسرین تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا، کچھ بھی نہیں۔ ادھوری جوانی، معمولی تعلیم، اوسط سے ذرا زیادہ خوش شکلی اور نسائیت ہی نسائیت۔

کہتے ہیں نسائیت عورت کا زیور ہوتی ہے۔ ہوگی۔ نسرین کیلئے تو وہ راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

شادی کے بعد اس کے سر پر ایک دم بیگم بننے کی مصیبت آ پڑی تھی۔ اور بیگم بننے میں نسائیت حائل تھی۔ بری طرح سے حائل تھی۔ چونکہ نسائیت تو خاص انوالومنٹ ہوتی ہے۔ اندھی انوالومنٹ۔ نسائیت کو چھپانے اور رد کرنے میں بیگم جاہ کو بہت محنت کرنا پڑی تھی کہ توبہ۔

بیگم جاہ اٹھ بیٹھی۔ پہلے وہ سنگھار میز کی طرف بڑھی۔ پھر رک گئی۔ اونہوں میں بیڈ روم کی بتی نہیں جلاؤں گی۔ وہ سمجھے گا میں بیڈ روم میں ہوں۔ پھر وہ باتھ روم کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ رات کے ڈھیلے ڈھالے گلابی لباس میں وہ بنی بجی گڑیا دکھائی دے رہی تھی۔

بیگم جاہ کے چہرے کے خدوخال تو عرصہ دراز سے کاسمیٹکس کے ملبے تلے دب چکے تھے۔ قبر تو نہ جانے کہاں تھی۔ صرف اوپر کا سنگ مرمری مرقد باقی رہ گیا تھا۔ پاؤڈر کے تہ در تہ پلستر نے چہرے کے مسام بند کر رکھے تھے۔ جلد روشنی اور ہوا کیلئے بلک بلک کر مردہ ہو چکی تھی۔ لیکن بیگم کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ چہرے کی جگہ ایک ماسک پہنے ہوئے ہے اور اس ماسک میں رنگ سے روپ ہے، لانگ رینج دل آویزی بھی ہے لیکن تازگی نہیں۔ آنکھوں بھنوؤں اور پلکوں کے مصنوعی شیپ نے اسے عورت سے گڑیا میں بدل رکھا ہے اسے اس حقیقت کا شبہ بھی نہیں تھا کہ اگر آپ گڑیا میں بدل جائیں تو آپ کا جی چاہتا ہے کہ کوئی آپ سے کھیلے۔

آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کے بعد وہ باتھ روم سے باہر نکل آئی اور ان جانے میں پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور باہر دیکھنے لگی۔

ارے یہ سٹوپڈ تو ابھی تک کھڑا ہے۔ میرے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ پاگل پنے کی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اس شخص نے تو حد کر دی۔ کوئی پوچھے کہ اسے کیا

حاصل نہ تھا۔ نوکری تھی، گھر میں ہر طرح کا آرام تھا اور پھر میں خود۔ وہ مسکرا دی۔ ہم دونوں کے راستے میں کوئی حائل نہ تھا۔ گھر میں سب کو پتہ تھا۔ رشو، بلو، پارہ، حتیٰ کہ جاہ کو بھی علم تھا۔ سبھی جانتے تھے، پر کوئی پابندی نہ کرتا تھا۔ الٹا وہ سب تو ہر وقت کوشش میں لگے رہتے کہ ایسا برتاؤ کریں جس سے ظاہر ہو کہ انہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔

لیکن اس احمق نے ان سب آزمائشوں اور اس حیثیت کو جو اسے حاصل تھی یوں ٹھکرا دیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ سٹوپڈ، بیگم جاہ غصے میں بڑبڑائی۔ اب وہاں ٹیلے کے ڈھلان پر سردی میں کھڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بے وقوف رات کے وقت سردی میں وہاں کھڑے ہو کر میری کھڑکیوں کی طرف گھورنے سے کیا ہوتا ہے۔ جسٹ میکنگ اے فول آف ہم سیلف۔

اس سلی فول سے بیگم کا صرف ایک مطالبہ تھا۔ کتنا ریزنیبل مطالبہ تھا۔ وہ یہ کہ آم کھاؤ پیڑ نہ گنو۔ پیار کرو جتنا جی چاہے کرو مگر اسے روگ نہ بناؤ۔ پیار تو گڈ ٹائم ہوتا ہے۔ انوالومنٹ نہیں ہوتا۔ انوالومنٹ ہو تو وہ روگ بن جاتا ہے۔ نیلی جھیل کی سطح پر کنول کی طرح تیرو مگر اس میں پتھر کی طرح ڈوبو نہیں۔ بھنورے کی طرح رس چوسو، پتنگے کی طرح شمع کو لو پر پر نہ جلاؤ۔

بیگم جاہ کے نزدیک انوالومنٹ ایک بہت ہی تکلیف دہ چیز تھی۔ اس نے زمانہ جہالت میں اپنی اس عادت کی وجہ سے بہت دکھ اٹھائے تھے۔ اتنی مار کھائی تھی کہ اب تک اس کے نشانات موجود تھے۔

اور وہ سٹوپڈ آدھی رات کو اس کے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے کھڑا اس کے پرانے زخموں کو کرید رہا تھا۔

نسرین کی شادی ہنگامی حالات میں ہوئی تھی وہ شادی کم تھی بھونچال زیادہ تھا۔ نسرین کے والدین سفید پوش لوگوں کی طرح ہاتھ پیلے کرنے کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ جہیز کی استطاعت نہ تھی صرف لڑکی ہی لڑکی تھی جسے انہوں نے بڑی مشکل سے دس جماعتیں

پاس کروایا تھا۔ چونکہ وہ ایک قصبے میں رہتے تھے۔ جہاں کالج نہ تھا۔ لڑکی کو شہر بھیجنے کی توفیق نہ تھی لہذا اس کی پڑھائی رک گئی تھی۔

وہ تو اتفاق سے مسٹر جاہ اس قصبے میں ایک سوشل تقریب پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے آ گیا۔ سکول کی ہیڈ مسٹریس نے تقریب کی انتظامیہ میں نسرین کو پیش پیش رکھا۔ جاہ نے اُسے دیکھا اور پتہ نہیں کس وجہ سے نسرین اسے پسند آ گئی۔ جاہ کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اسے ساتھی کی تو چنداں ضرورت نہ تھی چونکہ کلب لائف نے اسے اس ضرورت سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ بس نسرین اسے پسند آ گئی۔ جیسے کسی مویشی میلے میں کوئی بکری پسند آ جائے۔

جاہ نے نسرین کے والدین کو بلا کر پیغام دے دیا۔ وہ بیچارے بھونچکے رہ گئے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا والی بات تھی۔ اور پیشتر اس کے کہ یہ بھونچکا ختم ہوتا نسرین کا نکاح عمل میں آ گیا اور وہ بیگم جاہ بن کر گھر سے رخصت ہی ہو گئی۔

شادی میں نسرین کی رضامندی کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ پھر بھی شریف لڑکیوں کی طرح سہاگ رات کے بعد سے ہی اسے جاہ سے شدت کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ جاہ روایتی خاوند نہیں بلکہ بیگماتی خاوند ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بیگماتی خاوند کیا ہوتا ہے۔ پہلے دو ایک ماہ تو جاہ نسرین کی انوالومنٹ سے خاصا محظوظ ہوتا رہا۔ اس کے بعد جب وہ اس کی آزادی میں مخل ہونے لگی تو جاہ نے بڑے پیار سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا نسی ڈونٹ بی اے ڈیمانڈ آن می۔ مجھے اس حد تک نہ اپناؤ خود کو اسقدر انوالو نہ کرو۔ انوالومنٹ تو ایک (primitive) جذبہ ہے کلچر سوسائٹی میں نہیں چلے گا۔ اب تمہیں نسرین نہیں بیگم جاہ بن کر جینا ہے۔ میرے ساتھ کلب چلو، لوگوں سے ملو، اپنی سوشل حیثیت پیدا کرو۔ یہاں تو (live let live) کا اصول چلتا ہے۔

جاہ کی سوشل لائف کا محور کلب تھی جہاں اس کی بیشتر شامیں بسر ہوتی تھیں۔ پہلے تو وہ کلب لائف کو دیکھ کر ہکی بکی رہ گئی۔ (live let live) تو وہاں (love let live)

کے مترادف تھا۔ ہر شام عمدہ لباس، مہذب گفتگو اور انگریزی شراب سے ہوتی۔ اور بے لباسی، فحش ساونڈ ایفکٹس اور بھونڈے شباب پر جا کر ختم ہوتی۔

شروع شروع میں نسرین کو لوٹ لو کی یہ صورت نا قابل قبول نظر آئی۔ اس حد تک نا قابلِ قبول کہ وہ کلب میں سمٹ سمٹا کر ایک کونے میں بیٹھ رہتی۔ اس پر بیگمات نے انگلیاں اٹھائیں۔ تمسخر بھری کھسر پھسر ہوئی۔ یہ دیکھ کر جاہ بہت چیں بہ چیں ہوا۔ اور یہ چیں بہ چیں اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک روز پھوڑا پھوٹ پڑا۔ پہلے تو جاہ اسے پیار سے سمجھاتا رہا تھا۔ اس روز وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے اس کے برتاؤ کی تفصیلات پر شدید نکتہ چینی کی۔ اپنی پرسٹیج اور پوزیشن کے مطالبات گنوائے۔ علیحدگی کی دھمکی دے دی۔ نسرین کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ اس کے ماں باپ اس دوران میں ایک حادثے کی نذر ہو چکے تھے۔ کوئی رشتہ دار ایسا نہ تھا کہ سہارا دیتا۔ اس روز وہ دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ آخر اس نے سر اٹھایا، چہرہ عزم سے تمتا رہا تھا۔ ہاں میں بیگم بنوں گی۔ بیگم بن کر دکھاؤں گی۔

چار ایک ماہ میں وہ کلب کی محبوبہ بن گئی اور خوش پوش باذوق نوجوان اس کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ یہ کیفیت دیکھ کر جاہ پھولے نہ سمایا۔

اس دوران نسرین نے بیگم کی اس طرزِ زندگی کے خلاف بہت احتجاج کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ نسرین کی آواز مدھم پڑتی گئی۔ اور مدھم اور مدھم اور بالآخر احتجاج سسکیاں بن گیا۔ اور پھر آخری ہچکی کے بعد سکوت طاری ہو گیا۔ اور نسرین مکمل طور پر بیگم بن گئی۔ پھر اسے اس کھیل میں مزہ آنے لگا۔ کیوں نہ آتا مزہ، توجہ کا مرکز بننا عورت کیلئے بہت بڑی عشرت ہوتی ہے۔ ایک بار اس کی چاٹ لگ جائے تو نسائی تقاضہ روح سے کٹ کر جسم میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب بیگم طاری ہو گئی تو نسرین کی نگاہ سے پردے اور دل سے حجاب اٹھنے لگے اور اسے عظیم حقیقتوں کا احساس ہونے لگا۔

میں بھی کتنی بے خبر تھی کہ نسائیت کو عورت کا سنگھار سمجھتی رہی۔ بھٹ پڑے وہ سونا جو کان کاٹے۔ نسائیت گہنا نہیں روگ ہے۔ روگ پہلے دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کرتا پھر

اسے اپنا بنا لینے کی بجائے خود اس کا ہو جانا۔ اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے بھلا۔ نسائیت تو خالص انوالومنٹ ہے۔ جذبات کی مکڑی کا تنا ہوا جالا۔ جس میں پھنس کر اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اپنی سدھ بدھ نہ رہے تو دوسرے کو متوجہ کون کرے بھلا۔

نسرین دور میں وہ جذبات کے اس جال میں پھنس جانے کو ہی زندگی سمجھتی تھی۔

پھر جب وہ بیگم بن گئی تو اسے اپنی گزشتہ سادہ لوحی پر ہنسی آنے لگی۔ اب وہ جانتی تھی، سمجھتی تھی۔۔۔ اب اسے علم ہو گیا تھا کہ پھنسنا نہیں بلکہ پھنسانا زندگی ہے۔

نسرین خود مکھی بن کر جالے میں پھنسنے کو زندگی کا ماحصل سمجھتی تھی۔

بیگم مکڑی بن کر جالا تننے کو مقصدِ حیات سمجھتی تھی۔

نسرین تاثر سے بھیگ جانے کی دلدادہ تھی۔

بیگم کیلئے دوسروں کو متاثر کرنا زندگی کا عظیم راز تھا۔

دوسروں کو متاثر کرنے کیلئے لازم ہے کہ آپ خود مرکز بنیں۔ مرکز بننے کیلئے مضبوط قدموں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت چاہیے۔ اسی قیام کو پرسنیلٹی کہتے ہیں۔ اور نسائیت میں اس قیام کا فقدان ہے۔

کافی دیر بیگم جاہ نیند کا بہانہ کر کے پڑی رہی۔ لیکن نیند کیسے آتی جب دل میں یہ احساس بھرا ہوا ہو کہ ایک خوش شکل نوجوان تمہیں ایک نظر دیکھنے کیلئے باہر سردی میں کھڑا ٹھٹھر رہا ہے، تو نیند کیسے آتی۔

گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھی۔ پتہ نہیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ نہیں، نہیں وہ بولی۔ اس لئے نہیں کہ وہ سٹوپڈ فول باہر سردی میں کھڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ میں اس کی کیا پرواہ کرتی ہوں۔ میں اس کی کیا پرواہ کرتی ہوں۔ میں نے اس کی ضد صرف اس لئے مان لی تھی کہ مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ بیچارہ بالکل ہی بچہ ہے۔ پتہ نہیں مجھ سے کیوں اتنا اٹیچڈ ہے۔ کیوں اس قدر انوالو ہو گیا ہے۔ خوامخواہ، جن دنوں وہ میرا سیکرٹری تھا ان دنوں بھی پالتو کتے کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ اور جب میں ڈکٹیشن دیتی تو ٹکٹکی باندھ کر میرے منہ کی طرف

دیکھا کرتا تھا۔ میں نے تو کئی بار سمجھایا تھا کہ ایسا نہیں کیا کرتے، لوگ کیا کہیں گے۔ اس پر تو وہ کچھ دیر کیلئے آنکھیں نیچی کر لیتا لیکن پھر دورہ پڑ جاتا۔ پھر میرے منہ کو تکنے لگتا۔ سلی فول۔ پر ہے اتنا معصوم کہ توبہ ہے۔ جب بھی مجھے غصہ آتا تو اس قدر گھبرا جاتا کہ میری ہنسی نکل جاتی۔

اس نے ان جانے میں گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔

بیچارہ سردی میں ٹھٹھر رہا ہے۔ بیگم کے پہلو میں دبی ہوئی نسرین نے سر نکالا۔ ہٹاؤ اس ضد کو۔ دو ایک منٹ کی تو بات ہے۔ ایک نظر دیکھ کر آرام سے گھر جا کر سو جائے گا۔ اس نے خط میں لکھا نہیں تھا کہ میں مجبور ہوں۔ آپ کو دیکھے بغیر نیند نہیں آتی۔

خواہ مخواہ بیگم نے سوچا میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ انوالو کر لوں۔

گزشتہ پندرہ سالوں میں چار ایک مرتبہ بیگم کے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی نسرین نے کروٹ لینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے لگاؤ پیدا ہو رہا ہے اور وہ انوالو ہوتی جا رہی ہے۔ دو مرتبہ تو بروقت اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ لیکن ایک بار وہ اس شدت سے لگاؤ کے دھارے میں بہہ گئی تھی کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان دنوں نسرین بیگم پر ہنسا کرتی تھی۔ نسرین کی نسائیت سے بھری ہوئی ہنسی سن کر بیگم چونک پڑتی۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ عین اس طرح جس طرح کسی نودولتیے کو گزرا ہوا غربت کا زمانہ یاد آ جائے تو وہ چونک جاتا ہے۔ گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور پھر وہ اس تلخ یاد کو بھولنے کی کوشش میں شدت سے مصروف ہو جاتا ہے۔

وہ تو شکر ہے کہ بیگم کی انوالومنٹ ایک ایسے تاجر سے ہوئی تھی جس کی زندگی کا واحد مقصد دولت کمانا تھا۔ اس شغل میں وحید اس حد تک انوالو تھا کہ مزید انوالومنٹ کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ وہ زندگی کے دیگر مشاغل کو خوش وقتی سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا جو بیگم کی ان جانی سپردگی کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی۔

اگر وحید روپیہ کمانے میں اس شدت سے مصروف نہ ہوتا۔ اگر اس میں لگاؤ کی

ذرا بھی گنجائش ہوتی۔ اگر وہ بیگم کی دیوانگی کو جان لیتا۔ محسوس کر لیتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ شاید بیگم اجڑ کر رہ جاتی، اور نسرین ابھر کر پھر سے اس کی شخصیت پر چھا جاتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ پھر، پھر دفعتاً وحید کو ملک سے باہر جانا پڑا، اور حالات نے ایسا رُخ اختیار کر لیا کہ دو سال تک اس کی واپسی کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اس دوران میں بیگم نے اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر پھر سے استوار کر لیا اور لگاؤ کا وہ بندھن ٹوٹ گیا۔

مانا کہ دوسروں کو متوجہ کرنے کا شغل بے حد دلچسپ ہوتا ہے لیکن اگر وہ ہول ٹائم جاب بن جائے تو اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔

سارا وقت صرف فاخرہ لباس پہننے، میک اپ کرنے، جاذب ساعت ڈائیلاگ بولنے میں تو بسر نہیں ہو سکتا۔ یا اس سے بیگمات پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی ضمنی مصروفیت پیدا کریں۔ بیگم جاہ نے بھی دوسری بیگمات کی دیکھا دیکھی ویلفیئر شغل اپنا رکھا تھا اور اس مشغلے کو اس نے اس قدر سنجیدگی اور خلوص سے اپنا لیا تھا کہ ویلفیئر ایسوسی ایشن نے اسے وائس پریذیڈنٹ کے فرائض سونپ دیئے تھے۔

دو سال میں بیگم جاہ نے اپنا احاطہ کار اس قدر وسیع کر لیا کہ اسے خط و کتابت کے لئے ایک پی اے رکھنا پڑا۔ انجمن کی چیئرمین نے اس اسامی کیلئے خوش بخت کا نام پیش کر دیا۔ وہ ایک بہت ہی مفلوک الحال لیکن کام کرنے والا نوجوان تھا۔ انجمن سے وظیفہ لے کر اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور اب کسی آسامی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

خوش بخت اس قدر خوش شکل تھا، بھرا بھرا معصوم چہرہ، کنڈل والے بال اور چٹا سفید رنگ۔ اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مفلوک الحال ہے۔ خوش بخت آتے ہی بیگم کے ساتھ اس قدر اٹیچڈ ہو گیا کہ اس کے پیچھے پیچھے پالتو کتے کی طرح پھرنے لگا۔ بیگم کے منہ سے نکلی ہوئی بات اس کیلئے یوں تھی جیسے بہت بڑا حکم ہو۔ اسے بیگم کے چھوٹے چھوٹے کام سر انجام دینے میں راحت محسوس ہوتی تھی۔ چند ہی دنوں میں وہ اس کا پی اے ہی نہیں بلکہ خصوصی اسسٹنٹ بن گیا۔

پہلے تو بیگم خوش بخت کی اٹیچڈ منٹ دیکھ کر محظوظ ہوا کرتی تھی۔ پھر اس کی تمام تر ممتا جاگ اٹھی۔

ادھر دو سال بیگم کے گھر میں رہ کر خوش بخت کی کایا ہی پلٹ گئی۔ جوانی پھوٹ کر نکل آئی۔ گھنگھریالے بال کنڈل مار کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں پھلجھڑیاں چلنے لگیں۔

خوش بخت کو بیگم کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی عادت پہلے ہی تھی۔

جب بھی بیگم دیکھتی کہ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو وہ سرزنش کے طور پر ہاتھ بڑھا کر اس کا سر پیچھے کی طرف کر کے گھورتی ''اپنے دھیان سے بیٹھ'' پھر کچھ دیر کے بعد وہ دیکھتی کہ خوش بخت جھکی جھکی آنکھوں سے اس کے پیروں کو تک رہا ہے۔ ہے نا پاگل وہ سوچتی۔ اب پیروں کو تکے جا رہا ہے۔ پیر بھی کیا دیکھنے کی چیز ہیں۔ پیر ہی تو ہیں سٹوپڈ۔

لیکن سٹوپڈ کی نگاہوں کے سرخ چیونٹے پیروں پر بھنوروں کی طرح بھن بھن کرتے اور پھر پیروں سے اوپر چڑھنے لگتے۔

اب جب خوش بخت کی نگاہوں میں پھلجڑیاں چلنے لگیں تو حالات اور بھی سنگین ہو گئے۔

جب بھی وہ ٹکٹکی باندھے بیگم کی طرف دیکھتا تو وہ گھبراہٹ سی محسوس کرتی۔ یہ بے چینی جانے کہاں سے ابھرتی اور پھر سارے جسم میں پھیل جاتی۔ پھر جب وہ اسے سرزنش کرنے لگتی تو انجانی ہچکچاہٹ اس کا ہاتھ روک لیتی۔

پھر وہ دن آ گیا۔

اس روز وہ بیحد خوش تھی۔ چونکہ اس کا فنکشن بہت کامیاب رہا تھا۔ مہمانوں کی تحسین بھری نگاہوں کا جھولا ابھی تک اسے جھلا رہا تھا۔ فنکشن کے بعد وہ بہت تھک گئی تھی مسٹر جاہ کراچی گئے ہوئے تھے۔ لہذا سارا کام اس نے خود سر انجام دیا تھا۔ تھک کر وہ بستر پر جا بیٹھی۔

دفعتاً اُسے یاد آیا کہ مانگے کی چیزیں اسی وقت واپس کرنی تھیں۔ اس نے خوش بخت کو بلا لیا۔ وہ اس کے روبرو چھوٹی میز پر بیٹھ گیا اور بیگم اسے ہدایات دینے لگی۔

دفعتاً اس نے دیکھا کہ خوش بخت لکھنے کی بجائے اس کے منہ کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ غصے سے اس نے ہاتھ بڑھا کر خوش بخت کا سر جھٹکے سے نیچے کر دیا۔ خوش بخت اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کا سر بیگم کی گود میں جا گرا۔ خوشبو کا ایک ریلا آیا پھر اسے یاد نہیں۔

ادھر بیگم غصے میں چلا رہی تھی تو میری بات مانے گا یا نہیں۔ تو میری بات مانے گا یا نہیں۔

شروع شروع میں تو بیگم کا تو مانے گا یا نہیں کا مفہوم سرزنش تھا۔ لیکن بیگم کی گود میں گر کر اس کنڈل والے بالوں بھرے سر نے نہ جانے کیا کر دیا۔ خوش بخت کے انگاروں نے بیگم کی پھلجھڑیوں کو آگ دکھا دی۔ چھوٹے چھوٹے چراغ جلنے لگے۔ آنکھیں روشن ہو گئیں۔ آگ کے پھول چاروں طرف اڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ تو مانے گا یا نہیں کا مفہوم بدلتا گیا اور پھر دونوں ہی مان گئے۔ اور اس خوشی میں پھلجھڑیاں از سر نو نئے رنگوں میں جلنے لگیں اور کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔

اس کے بعد بھی جب خوش بخت نے بیگم کی طرف والہانہ تکنا نہ چھوڑا تو بیگم کو سخت غصہ آیا۔ اب احمقوں کی طرح میرے منہ کی طرف کیوں دیکھتا رہتا ہے اب اور کیا چاہیے اسے، سٹوپڈ۔ کوئی پوچھے کیا حاصل نہیں اسے نوکری ہے گھر میں ہر طرح کا آرام ہے اور پھر میں خود۔

اس نے بار ہا اسے ٹوکا۔ سٹوپڈ یوں نہیں دیکھا کرتے۔

لیکن خوش بخت کیا جواب دیتا بیگم کی طرف دیکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اس نے کہا۔ بیگم صاحبہ میں کیا کروں آپ کی طرف دیکھے بغیر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

اس پر بیگم نے اسے بار بار سمجھایا، پیار سے سمجھایا۔ بیوقوف جتنا جی چاہے پیار کرو

لیکن اسے روگ نہ بناؤ۔ جھیل کی سطح پر کنول کی طرح تیرو، پتھر کی طرح ڈوبو نہیں۔

بات تو خوش بخت کی سمجھ میں آ گئی تھی پر بات پر عمل کیسے کرتا یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ گھر کی تو خیر کوئی بات نہ تھی گھر میں کوئی مائنڈ نہ کرتا تھا۔ لیکن جب ایسوسی ایشن کی ممبر خواتین میں بات پھیلنے لگی تو بیگم جاہ سکینڈل سے گھبرا گئی۔

تعلق کی تو خیر کوئی بات نہ تھی وہ تو بیگم کا ذاتی معاملہ تھا لیکن پی اے کے ساتھ یہ بات انہیں قابلِ قبول نہ تھی۔

بیگم جاہ چار ایک دن تو سوچتی رہی آخر اس نے خوش بخت کو علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ویلفیئر ایسوسی ایشن کی پریزیڈنٹ کو خط لکھا کہ میری طبعیت ناساز ہے لہٰذا کچھ عرصہ کیلئے میں وائس پریزیڈنٹ کے فرائض ادا نہ کر سکوں گی۔ خط کے ساتھ ہی اس نے ریکارڈ اور اپنے پی اے کو بھیج دیا کہ اسے نئی وائس پریزیڈنٹ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔

بیگم کے اس فیصلے پر خوش بخت ہکا بکا رہ گیا۔ جب وہ جانے لگا تو بیگم نے منہ پکا کر کے کہا ”آج سے تمہارا اس کوٹھی میں داخلہ بند ہے۔“

خوش بخت کے جانے کے چار ایک دن بعد اس خوش بخت کا ایک خط موصول ہوا، لکھا تھا، بیگم صاحبہ آپ کو دیکھے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا، میں اور کچھ نہیں، اور کچھ نہیں مانگتا میری صرف ایک بات مان لیجئے روزرات کے دس بجے بتی جلا کر بیڈروم کی کھڑکی میں کھڑی ہو جایا کیجئے صرف ایک دو منٹوں کیلئے تا کہ میں آپ کو دیکھ سکوں۔

گھڑی نے گیارہ بجا دیئے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اب تو چلا گیا ہو گا اس نے سوچا۔ اتنی دیر تک اس سردی میں کون کھڑا ہو سکتا ہے۔

اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ہائے اللہ وہ تو ابھی تک کھڑا ہے۔ کھڑکی پر نگاہیں گاڑے کھڑا ہے۔ غصے سے اس کنپٹیاں تھرکنے لگیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کاش وہ قریب ہوتا اور میں اس کا سر نیچے جھٹک کر اسے سرزنش کرتی، مانتا ہے کہ نہیں۔

اس مانتا ہے کہ نہیں نے نہ جانے کیا کر دیا۔ جیسے کوئی سوچ آن ہو گیا۔ بیگم کے

سارے جسم میں پھلجھڑیاں چلنے لگیں۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔ کیا کروں میں۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ لپک کر اس نے کھڑکی کھولی اور پھر بیڈ کے سرہانے لگی ہوئی بتی جلا کر خود بھرپور روشنی میں کھڑی ہو گئی۔

اس وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پھر سے نسرین بن گئی ہو اور اس کی روح میں ایک ننھا سا دیا روشن ہو گیا ہو۔

دھواں دھارایوان

پتہ نہیں میں اس ایوان میں کیسے داخل ہو گیا شاید اس لئے کہ وہ شاہراہ جس پر میں گام زن تھا۔ بے حد کراوڈ ڈ تھی اتنی کراوڈ ڈ کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے کراؤڈ فوبیا ہے نا اس لئے۔

شاہراہ پر صرف لوگوں کی بھیڑ نہ تھی۔ وہاں کئی ایک بھیڑیں تھیں۔ رفتار کی بھیڑ تھی، رنگوں کی بھیڑ تھی۔ آوازوں کی بھیڑ تھی۔ تیز طراری کی بھیڑ تھی۔ اور پھر مجمعے سے خواہشات اور آرزوؤں کی بھڑاس نکل رہی تھی۔ اگزائی اور پری آ کوپطیش کی تجاوزات زاڑ رہی تھی کہ سانس لینا دشوار تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ شاہراہ نہیں بلکہ پیپ سے بھرا ہوا اک پھوڑا ہو۔ میرا دم رکنے لگا۔ دم لینے کیلئے میں نے دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک بہت بڑا محراب دار دروازہ تھا میں سوچے سمجھے بغیر داخل ہو گیا۔

ٹھہرئیے شاید یہ وجہ نہیں تھی میں ایوان میں اس لیے داخل ہوا تھا کہ وہ شاہراہ جس پر میں گامزن تھا اک لق ودق ویرانہ تھی۔ وہاں کوئی انسان نہ تھا۔ الو بول رہا تھا۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ منڈیروں پر بیٹھے گدھ حریضانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان لاشوں سے سڑاھند اٹھ رہی تھی ننگے جسموں کی سڑاند حرص کے کیڑے جسموں پر رینگ رہے تھے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے اندھیرا فوبیا ہے نا۔ اس لئے میں بھاگا کہ کہیں روشنی دکھائی دے تا کہ میرا رکتا سانس تسکین پائے۔ سامنے ایوان کے محرابی دروازے میں ایک دودھیا بلب روشن تھا میں اندر داخل ہو گیا۔ پتہ نہیں کون سی بات سچ ہے شاہراہ پر بھیڑ تھی یا ویرانی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں چونکہ عرصہ دراز سے میری یادداشت دھندلا چکی ہے۔ باتیں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔

بہر حال چاہے بھیڑ سے گھبرا کر یا ویرانے سے ڈر کر میں ایوان میں داخل ہوا۔ کیا

فرق پڑتا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ میں گھبرا کر ایوان میں داخل ہو گیا۔

باہر سے یہ ایوان بڑا بارعب اور عالی شان تھا اتنا عالی شان کہ اگر شدید مجبوری نہ ہوتی تو میں اندر داخل ہونے کی جسارت نہ کرتا۔ میں کمتری نفس کا مارا ہوا ہوں۔ مجھے ہر بڑی چیز سے ڈر آتا ہے۔ اصلی شخصیتوں سے خائف ہو جاتا ہوں۔ بڑے لوگوں کے روبرو سمٹ کر معدوم ہو جاتا ہوں۔ عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ شاہراہ اوٹ میں آ جائے کچھ دم کیلئے کھڑا ہو کر ستا لوں۔ میرا نفس پھر سے بحال ہو جائے۔ صرف اتنا ہی، ایوان کے اندر جانے کا ارادہ نہ تھا۔ اس لئے میں دروازے کے پیچھے دبک کر کھڑا ہو گیا پھر جو دیکھتا ہوں تو میرے ارد گرد گاڑھا ملگجی دھواں بچھا ہوا ہے پتہ نہیں کہاں سے آیا ہے۔ غالباً دھواں اندر سے آ رہا تھا۔ میں از سر نو گھبرا گیا۔ اس سے تو باہر کی گھٹن ہی اچھی تھی۔ میں نے سوچا۔ باہر نکلو اس دھوئیں سے نجات ملے۔ لیکن دھوئیں کی وجہ سے باہر جانے کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہرطور میں چل پڑا چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ دفعتاً وہ میرے سامنے کھڑا تھا اونچا لمبا بانکا۔ لیکن کھویا ہوا، اتنا کھویا ہوا وہ گہری سوچ میں پڑا ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ڈر گیا لیکن وہ اسقدر کھویا ہوا تھا کہ بے بسی اور بیچارگی نے اسکے چہرے پر گھونسلے بنا رکھے تھے۔ اسے میری موجودگی کا علم ہی نہ تھا۔ میں اسکے پاس گیا۔

''جناب دروازہ کدھر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چونکا۔ ''دروازہ'' وہ چلایا۔ ''دروازہ اور کھڑکی کمیونی کیشن کے سمبل ہیں۔ یہاں کوئی کمیونی کیشن نہیں کھڑکی نہیں دروازہ نہیں۔ ہاں دروازہ۔'' دفعتاً اسپر وہی کھویا پن طاری ہو گیا۔ وہ بھول گیا کہ مجھ سے مخاطب تھا بھول گیا کہ میں اسکے روبرو کھڑا تھا۔ پھر سے دیوانہ وار ٹہلنے لگا۔

''دروازہ ہوتا تو جنازے کو راستہ مل جاتا۔ لیکن جنازہ بھٹک رہا ہے۔ ہمیشہ بھٹکتا رہے گا۔''

''جنازہ؟'' میں گھبرا گیا ''کیسا جنازہ۔''

''جنازہ بھرے چوک میں گم ہو گیا تھا۔ دفعتاً سوگوار رک گئے۔ میت کہاں ہے۔ وہ سب میت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔''

''میت؟ کون سی میت؟'' میں نے پوچھا۔

دفعتاً وہ میری طرف مخاطب ہوا۔ ''تم کون ہو تم یہاں کے نہیں لگتے۔''

''میں، میں۔'' میں گھبرا گیا ''میں راستہ بھولا ہوا ہوں۔''

''راستہ'' وہ چلایا۔ ''کون سا راستہ۔ کیسا راستہ جب راستہ ہی نہیں تو بھولنے کا مطلب، یہاں کوئی راستہ نہیں سب ڈنڈیاں ہی ڈنڈیاں۔ جو چلتی نہیں۔ رینگتے جاتی ہیں۔ راستہ وہ ہوتا ہے جو چلے جائے۔''

''لیکن میں تو باہر جانا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنسا۔ ''باہر کون سا باہر۔ یہاں تو صرف اندر ہی اندر چلتے جاؤ چلتے جاؤ۔ اندر ہی اندر اندر ہی اندر باہر ہوتا تو جنازہ نکل نہ جاتا۔ اب وہ میت کے بغیر ہی جنازہ لئے پھر رہے ہیں۔ میں۔'' دفعتاً وہ مڑا ''اب کہیں تم ہی تو میت نہیں۔'' وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

''ہاں بالکل بالکل تم ہی میت ہو۔ ذرا ٹھرو۔ یہیں میں انہیں بلا کر لاتا وہ تمہاری تلاش میں سرگرداں ہیں۔'' یہ کہتا ہوا وہ دھویں میں گم ہو گیا۔

اسکے جانے کے بعد دفعتاً مجھے خیال آیا کہ شاید وہ سچ کہتا ہو۔ شاید میں واقعی میت ہوں۔ مجھے خود سے مشک کافور کی بو آنے لگی۔ اتنا خوف طاری ہوا کہ میں دیوانہ وار بھاگا اس امید پر کہ شاید دروازہ مل جائے۔ لیکن جوں جوں میں بھاگ رہا تھا اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔

پکڑو پکڑو۔ میت میت، چاروں طرف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میرے پاؤں بھاری ہو گئے۔ خوف کی وجہ سے جسم شل ہو گیا۔ میں رک گیا۔ آوازیں بند ہو گئیں۔ شکر ہے میں نے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا اور رُک کر دم لینے کے لئے

ہو نکلنے لگا۔ ارے میرے سامنے ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرا تھام رکھا تھا نگاہیں پتہ نہیں کہاں ٹکی تھیں۔ عینک ماتھے پر ٹکی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔ لیکن اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

''شاید یہی وہ میت ہو جسے تم ڈھونڈ رہے تھے۔''

''شاید۔''

''تم کون ہو؟'' میں نے قریب جا کر پوچھا۔ اسمیں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ جوں کا توں بیٹھا رہا۔ ''تم میت ہو کیا؟'' میں نے پھر پوچھا۔ وہ چونکا۔

''ہاں میت۔ ہاں میت۔ میت۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں۔ میں کون ہوں۔ ہاں یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں کون ہوں۔ تم۔ تمہیں پتہ ہے کیا۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کہ میں کون ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ بتاؤ اسنے منت کی میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ پہلے مجھے پتہ تھا۔ سب پتہ تھا۔ یہ بھی کہ میں، میں کون ہوں۔ پہلے میں میں تھا۔ لیکن اب میں علامت ہوں۔ کس کی علامت ہوں۔ یہ نہیں پتہ سب علامتیں ہیں۔ سب۔''

'کس کی علامت؟'' میں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ بولا۔ ''علامت کو کیسے پتہ ہو کہ وہ کس کی علامت ہے۔ یہ دھواں دیکھ رہے ہو۔ یہ بھی علامت ہے یہ ایوان بھی اور اس میں ٹمٹماتے دیے بھی۔ اور تم۔ لیکن ٹھہرو تم کون ہو۔''

''میں راستہ بھولا ہوا ہوں۔ راستہ ایک وژن ہے۔ فریب نظر کمیونی کیشن کا سراب۔ فرد راستہ ہے گونگا راستہ دو راستے قریب آتے ہیں اور قریب اور قریب پھر تصادم

ہوتا ہے کمونی کیشن نہیں ایک دوسرے کو کاٹتے نہیں تصادم ہوتا ہے اور پھر ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ اور دور اور دور اور دور۔ راستہ، راستہ، راستے کی بات کس نے کی۔'' ادھیڑ عمر کا ایک آدمی پائپ پیتا ہوا داخل ہوا۔

''بھئی یہ کوئی زمینی جگہ نہیں جہاں راستے ہوں۔ تم نے فضا میں پرندوں کو اڑتے دیکھا ہے وہاں راستے ہوا کرتے ہیں کیا۔

پُراسرارآوازیں

آدھی رات کے گھپ اندھیرے سے آمنہ کی سرگوشی ابھری

''سن رہے ہو۔''

علی جو نے سمجھا کہ وہ بھی ان زیرلبی باتوں کا حصہ ہے جو وہ بڑی دیر سے سن رہا تھا۔اس لئے وہ چپ چاپ لیٹا رہا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دیر کے بعد آمنہ کی آواز پھر آئی ،''میں کیا پوچھ رہی ہوں۔''

''یہ تم ہو آمنے۔''جو بولا۔

''ہاں میں ہوں اور کون ہوگا یہاں۔''

''یہاں اور بھی ہیں۔''

''تم ان کی باتیں سن رہے تھے۔''

''ہاں سن رہا تھا۔''

''یہ کیسی آوازیں تھیں۔''

''پتہ نہیں۔''

''ایسے لگتا تھا جیسے بچے بول رہے ہوں۔''

''ہاں بچے بول رہے تھے پر آمنے اس گھر میں بچے کہاں سے آئے۔''

''پتہ نہیں''،آمنے نے کہا''پر بچے بول رہے تھے۔''

علی جو چپ ہو گیا۔کرنے کی کوئی بات ہوتی تو وہ کرتا۔کمرے پر خاموشی چھا گئی پھر آہستہ آہستہ دریا کا شور اُبھرنے لگا۔

آمنہ کی آواز پھر ابھری،''جو مجھے ڈر لگتا ہے۔''

"ڈر کس بات کا؟"

"وہ آوازیں پھر شروع ہو جائیں گی۔"

"بچوں ہی کی ہیں، بچوں کی آوازوں سے کیوں ڈرتی ہو؟"

"تم نے سنا نہیں ان آوازوں میں کتنا دکھ تھا۔"

"ہاں دکھی آوازیں تھیں۔"

"کتنی حسرت تھی۔"

"ہاں حسرت تھی، روئی روئی آوازیں۔"

"مجھے ایسا لگا جیسے پھوڑوں میں ٹیسیں اُٹھ رہی ہوں۔"

"ہاں بڑی دکھ بھری آوازیں تھیں۔"

"اٹھ کر دیکھتے کیوں نہیں جو۔"

"کیا دیکھوں؟"

"یہی کہ بچے کہاں ہیں، کس جگہ سے بول رہے ہیں، میں لالٹین جلاؤں۔"

"جلالے۔"

آمنہ نے لالٹین جلائی وہ دونوں اُٹھ بیٹھے انہوں نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ آمنہ اور جو کو اس مکان میں آئے ہوئے صرف کچھ دیر ہوئی تھی۔ اس گھر میں یہ اُن کی پہلی رات تھی۔ اس سے پہلے وہ ڈنگے بٹے کے اوپر ایک جھگی میں رہتے تھے جہاں جو کی تھوڑی سی زمین تھی۔ جس پر کنبے کا گزارہ تھا۔ پھر جو کا اکلوتا بیٹا جوان ہو گیا اور اُسے کویت میں نوکری مل گئی جو کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا، ان کے دن پھر گئے۔

دریائے نیلم کے کنارے ایک مکان سالہا سال سے غیر آباد پڑا تھا۔ اس کا ایک حصہ جلا ہوا تھا۔ باقی حصے خرد برد ہو چکے تھے۔ جو نے فرخ کے بھیجے ہوئے روپے سے وہ مکان خرید لیا۔ پھر کئی ایک ماہ وہ اس مکان کی مرمت میں لگا رہا۔ پہلے خود پتھر ڈھوتا رہا۔

دیواروں کے شگاف پُر کرتا رہا پھر لکڑی کے کام کیلئے ایک ترکھان لگا لیا۔

چھ مہینے کی مسلسل محنت کے بعد مکان رہنے کے قابل ہو گیا تو میاں بیوی دونوں ڈنگے بٹے کے جھونپڑے کو چھوڑ کر نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔

اس روز وہ بہت خوش تھے۔ مکان بڑی بارونق جگہ پر تھا۔ قریب ہی جھول کا گاؤں تھا۔ سڑک پر یہاں وہاں دکانیں تھیں۔ جب سے نیلم دریا پر سڑک تعمیر ہوئی تھی وادی میں ریل پیل ہو گئی تھی۔

وادی کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ دریا کے دوسرے کنارے کی پہاڑیوں پر دور مار توپیں اور مشین گنیں نصب ہیں جو سڑک کو کسی بھی وقت زد میں لے کر بند کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں کوئی کھوٹ نہ تھا، کوئی بیر نہ تھا۔ وہ سب قسمت پر شاکر تھے۔ انہیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی اور اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ انہوں نے اپنے دکھ درد کی گٹھڑی اللہ کی دوا پر رکھ دی تھی۔ انہیں کامل یقین تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب ان کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے وحدت کی شکل اختیار کر لے گا۔

نئے گھر میں جا کر جو سارا دن دریا کے کنارے کھاٹ ڈال کر حقہ پیتے ہوئے سڑک کی گھما گھمی کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ آمنہ گھر کے اندر جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی تھی۔ جب رات پڑی تو وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ لیٹ گئی اور گہری نیند سو گئی۔

آدھی رات کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی اس نے محسوس کیا جیسے کمرے میں کوئی موجود ہو۔ مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ معصوم آوازیں، دکھ سے بھیگی ہوئی آوازیں۔ سرگوشیاں، دو بچے آپس میں باتیں کر رہے تھے، آواز اسقدر مدھم تھی جیسے سسکیاں لے رہی ہوں۔

"آپی"، ایک نے سسکی لی۔

"جی میری جان۔"

"کتنا اندھیرا ہے آپی۔"

"ہاں میری جان۔"

"یہ اندھیرا کب دور ہوگا آپی۔"

"ضرور دور ہوگا میری گڑیا۔"

"میرا دم گھٹتا ہے آپی، کب صبح ہوگی، کب صبح ہوگی، کب صبح ہوگی۔"

وہ آواز مدھم پڑتی گئی اور مدھم اور مدھم حتیٰ کہ وہ ایک آہ بن کر رہ گئی۔

پھر وہ آہ سارے کمرے میں پھڑ پھڑاتی اور دیواروں سے ٹکراتی رہی تھی کہ خاموشی چھا گئی، گہری خاموشی، پھر دریا رونے لگا، روتا رہا روتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہی دکھی کراہیں پھر ابھریں۔

"آپی"، کسی نے سسکی بھری۔

"جی میری جان۔۔۔" اور آوازوں کا وہ چکر پھر سے چلنے لگا۔

یونہی ساری رات بیت گئی۔ تنگ آ کر آمنہ اٹھی اس نے لالٹین جلائی اور دونوں میاں بیوی نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن اُن آوازوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ یونہی صبح ہو گئی۔

اگلے روز سارے گاؤں میں جو کے گھر کی پُراسرار آوازوں کی خبر پھیل گئی۔ گھروں میں، کھیتوں میں، دوکانوں پر، سڑک پر ہر جگہ باتیں ہو رہی تھیں۔ پُراسرار آوازوں کی باتیں۔

جگہ جگہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ان آوازوں کا مطلب کیا ہے۔ اندھیرا کہاں ہے۔ کس اندھیرے کی بات ہے۔ کس صبح کا انتظار ہے۔

چھوڑو بھائی تم خواہ مخواہ بچوں کی باتوں کو لے بیٹھے ہو۔ ایک نے کہا۔ دوسرا بولا اندھیرا تو روز رات کو ہوتا ہے اور صبح کے وقت چھٹ جاتا ہے۔

تیسرے نے کہا اس وادی میں صبح تو اس روز ہوگئی تھی جب کچی سڑک کو پختہ بنا

دیا گیا تھا۔ اس روز سے وادی کا نصیب جاگ اٹھا ہے۔

بالکل ٹھیک کہتے ہو، کسی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ جب سے سڑک بنی ہے جگہ جگہ چھوٹے ہسپتال قائم ہو گئے ہیں۔ گاؤں گاؤں اسکول بن گئے ہیں۔ سارا دن اور آدھی رات تک ویگنیں اور سوزوکیاں چلتی ہیں۔ ہمارا مال منڈی تک ایک دن میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک دن میں۔

اس رات گاؤں کے تمام لوگ جو کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے چارپائیاں بچھالیں، حقے بھر لئے اور پھر آوازوں کا انتظار کرنے لگے۔

آدھی رات کے وقت جب معصوم بچوں کی کراہٹیں بیدار ہوئیں تو سب لالٹین لے کر ڈھونڈنے لگے۔ دو گھنٹے کی تلاش کے بعد پڑچھتی پر ایک آدھ جلے لکڑی کے صندوق پر سب کی نگاہیں جم گئیں۔

نوجوانوں نے آدھ جلا صندوق نیچے اتار لیا اور پھر انتظار میں بیٹھ گئے کہ آوازیں پھر سے ابھریں۔

واقعی وہ پُراسرار آوازیں اسی صندوق سے آرہی تھیں۔ انہوں نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا۔ اندر ایک آدھ جلا لحاف پڑا تھا۔ لحاف میں کچھ ہڈیاں پڑی تھیں اور باقی راکھ۔ انہوں نے صندوق اٹھا کر دریا برد کر دیا۔

اس روز سے وہ آوازیں دریا کی موجوں میں گھل مل گئیں اور دریا کے طول و عرض تک پھیل گئیں۔ اب روز رات کے وقت جب صبح کاذب کا مٹیالا اندھیرا پھیلتا ہے تو دریا سے ان معصوم بچوں کی آہیں اور کراہیں سرگوشیوں میں ابھرتی ہیں اور ساری نیلم وادی میں گونجتی ہیں۔

"کتنا اندھیرا ہے آپی۔"

"یہ اندھیرا کب دور ہوگا؟"

"میرا دم گھٹتا ہے آپی۔"

’’کب صبح ہوگی، کب صبح ہوگی، کب صبح ہوگی۔‘‘
یہ کراہ ساری وادی میں پھیل جاتی ہے۔
جنگل میں پتہ پتہ اسے دہراتا ہے۔
پہاڑوں کا پتھر پتھر اسے اچھالتا ہے۔
وادی پر چھائے ہوئے بادلوں کے ٹکڑے اسے اپنے بازو۔ل پر اٹھا کر دور دور لے جاتے ہیں۔
لیکن وادی کے رہنے والے اسے سمجھ نہیں پاتے پوچھتے ہیں کیسا اندھیرا، کہاں ہے اندھیرا۔
کیسی صبح، صبح تو مدت سے ہو چکی۔
روپے کی ریل پیل اور مادی ترقی سے ان کی سمجھ پر پتھر ڈال دیئے ہیں۔

افسانہ نویس

ہاتھ میں پنسل کاغذ تھامے ظہیر راضی گہری سوچ میں پڑا تھا۔ دفعتاً نیچے محلے کے چوگان سے شور اُٹھا۔ اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔

شمع رکشے سے اتر رہی تھی۔ اس کی آمد پر پہلے تو شور اٹھا پھر چوگان پر سناٹا چھا گیا۔ نوجوان کا دم اندر کا اندر باہر کا باہر رہ گیا۔ اندر کم باہر زیادہ۔

بڑے بوڑھے چلتے چلتے رک گئے تھے۔ پیشانیوں پر تیوریاں ابھر آئی تھیں ظاہر تھا کہ وہ بل کھا رہے ہیں۔ باہر کم اندر زیادہ۔

سیاہ برقعے میں چلتے ہوئے وہ یوں ابھر سمٹ رہی تھی جیسے واپڈا کی کالی تار ہو جس میں دو ہزار کی اے سی کرنٹ دوڑ رہی ہو۔

دیکھنے میں تو شمع فردِ واحد تھی لیکن پتہ نہیں کیا تھی کتنے رنگوں میں جلتی تھی۔ گھر میں لالٹین کی طرح ٹمٹماتی مدھم مدھم کھڑکی میں سرچ لائٹ کی طرح چندھیاتی۔

چوگان میں ملفوف کرنٹ اور یونیورسٹی میں کالی نیام سے باہر نکل کر ننگ دھڑنگ شعلہ۔ ابھی عمر کی کچی تھی اسے معلوم نہ تھا کہ ننگی کی نسبت ملفوف زیادہ کاٹ کرتی ہے۔

راضی کا شدت سے جی چاہا کہ اس بیک وقت ننگی اور ملفوف پر افسانہ لکھے۔ کتنا روشن موضوع ہے کتنا رنگین۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا۔۔۔

ہال میں سناٹا طاری رہا۔

چاچا احمد علی اے چاچا احمد علی۔ چوگان میں رضیہ چلائی۔ کچھ فکر بھی ہے تجھے۔ اپنی ثریا کی شادی اسی مہینے کی چوبیس کو ہے۔

یاد ہے دھئی مجھے یاد ہے۔ چاچا احمد علی نے جواب دیا۔ ابراہیم کو چاول کے لئے

تاکید کردی ہے کہ باسمتی ہو۔نئی نہیں پرانی۔رحیم مصالحے والے کو کہہ دیا ہے کہ سپیشل مصالحہ تیار کر رکھے۔صوبے قصائی سے گوشت کی بات کرلی ہے۔تو کیوں فکر کرتی ہے دھیئے۔جب تک چاچا احمد علی جیتا ہے محلے والوں کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

چاچا احمد علی محلے کا عظیم کردار تھا۔

محلے میں کسی کے گھر کوئی تقریب ہوتی، برات، منگنی، ختنے ولیمہ تو کھانے پکانے کا سارا انتظام چاچا احمد علی کو سونپ دیا جاتا۔چاچا احمد علی اس پر اس قدر مسرور ہوتا جیسے وہ ذمہ داری بوجھ نہیں بلکہ نوازش ہو۔اس کے بعد وہ انتظامی امور میں یوں کھو جاتا کہ ذات کی سدھ بدھ نہ رہتی۔بیگانے کام کو یوں اپنا لیتا جیسے ذاتی عزت کا سوال ہو۔چیزیں لڑ لڑ جھگڑ جھگڑ کر خریدتا یوں مول تول کرتا جیسے اپنی جیب سے رقم ادا کرنی ہو۔ہر تقریب کے دن صبح سے لے کر گئی رات تک یوں دیگوں پر کھڑا رہتا جیسے خزانے کا سانپ ہو۔پھر جب کھانا تقسیم کرنے کا وقت آتا تو چاچا احمد دین پر گویا قیامت ٹوٹ جاتی، چہرہ فکر سے لٹک جاتا۔دل دھک دھک کرتا۔پسینے چھوٹ جاتے۔دل ہی دل میں دعائیں مانگتا یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے کہیں کھانا کم نہ ہو جائے، کوئی نقص نہ نکل آئے۔کوئی اعتراض نہ کردے۔یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔بے شک چاچا احمد دین ایک عظیم کردار تھا۔راضی کا جی چاہا کہ وہ چاچا احمد علی کو اپنے افسانے کا موضوع بنائے۔اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگا۔۔۔ہال میں سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا۔

راضی کا یہ محلہ شیخاں شہر کے اس حصے میں آباد تھا جو ابھی تک چار دیواری میں ملفوف ہے۔محلے میں ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔دلچسپ مضحکہ خیز، چار دیواریاں ڈھے چکی تھیں۔چقیں کب سے لپٹ لپٹا چکی تھیں کچھ اب تک لٹک رہی تھیں۔حجاب ختم ہو چکے تھے لیکن حجاب آتے جاتے تھے۔آتے کم کم جاتے زیادہ۔بڑے بوڑھوں کے سرزنشی کھنکھار اپنی سرتال کھو چکے تھے۔لیکن کھنکنار اب بھی بجتے تھے۔محلے کی بوڑھیوں کی چہ میگوئیاں بے اثر ہو چکی تھیں لیکن وہ یوں جاری تھیں جیسے تیر بہدف ہوں۔نوجوانوں کی تاریں تنی ہوئی

تھیں، لرزشیں جاری وساری تھیں۔بڑے بوڑھے انہیں سنتے اور یوں پاس سے گزر جاتے جیسے سُنی ہی نہ ہوں۔وہ جانتے تھے کہ نوجوان بج رہے ہیں لیکن یوں جیسے خبر ہی نہ ہو۔

نوجوان جانتے تھے کہ بڑے بوڑھے جانتے ہیں لیکن وہ ایسے طرز عمل کو روا رکھتے جیسے بڑے بوڑھوں کو پتہ ہی نہ ہو۔اندر بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکیاں باہر نکل نکل جاتی تھیں۔مگر اندر بیٹھی رہتی تھیں۔سارا محلہ ڈول رہا تھا لیکن محلے کے باسی یوں دکھائی دیتے جیسے قائم ہوں، ڈولن کو کوئی خطرہ موجود نہ ہو۔سب اچھا۔

کتنی دلچسپ سچویشن تھی۔مضحکہ خیز نہیں۔لطیفہ خیز تبسم ریز۔

راضی کا جی چاہا کہ وہ محلے پر افسانہ لکھے اس نے قلم اٹھایا۔۔۔ہال پر چھایا ہوا سناٹا اور بھی دبیز ہو گیا۔اس نے قلم روک لیا۔

دفعتاً بتیاں بجھ گئیں۔اس نے ایک گھٹن سی محسوس کی۔۔۔گھٹن۔اس کے ذہن میں خیال آیا۔۔۔ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔

راضی نے موم بتی روشن کی روشنی میں کاغذ پر اپنے افسانے کا عنوان لکھا ''گھٹن''۔

ادُھوری بات

''شی از میڈ آفٹر ہم'' سانولی نے کہا۔

''ہو،شی'' گوری بولی

''رضو اور کون۔''

''وہ جو ڈال گرل ہے، وہ۔۔۔''

''وہی جو یوں بنی بجی رہتی ہے جیسے بیگم ہو۔''

''تصویر تو ہے ناں، اور وہ بھی فریم لگی، سارا دن پوز مارتی رہتی ہے، پہلے اکنامکس کے سر پر مکھی کی طرح بھنبھناتی رہی، سلی فول۔''

''سلی فول کیوں۔ اکنامکس کا سر بڑا بانکا ہے۔ مسکراتا ہے تو سیون اپ کھل جاتی ہے، دیکھتا ہے تو پھلجڑی چل جاتی ہے''۔ گوری نے خواب آلود نگاہوں سے کہا۔

''پھر بھی سر تو اکنامکس کا ہے نا'' سانولی نے آنکھیں مٹکائیں۔ بیگم کو گھر کیوں ڈالنے لگا۔ اس قدر اَن اکنامک بات۔''

گوری ہنس پڑی ''آج کل تو سبھی کے سر پر اکنامکس کا بھوت سوار ہے''۔ سانولی جھک کر کان میں منہ دے کر بولی ''تیرا تانیو تو ایسا نہیں وہ تو سراسر رومانٹک ہے۔''

''شٹ اپ'' گوری نے اسے گھورا۔

''کس کس کو شٹ اپ کرے گی ڈارلنگ۔''

دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ اوپر کی برتھ پر سوئی ہوئی خاتون جاگی ہوئی ہے اور سن رہی ہے اس لئے وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔

گاڑی سرسبز پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی یوں ہونک رہی تھی جیسے چڑھائی چڑھتے چڑھتے تھک گئی ہو۔

دور مغرب میں سورج تانبے کے تھال کی طرح آسمان پر ٹنگا ہوا تھا، ہوا بند تھی۔ اونچے لمبے درختوں کے پتے سہمے ہوئے تھے جیسے کسی آنے والے طوفان کی بو سونگھ کر ڈر گئے ہوں۔

دیر تک ڈبے پر خاموشی طاری رہی پھر سانولی لڑکی خاتون سے بولی۔ ''آپ بھی میراں پور جارہی ہیں نا؟''

''نہیں'' خاتون نے جواب دیا ''میں آگے جاؤں گی۔''

''آگے'' سانولی نے حیرت سے دہرایا۔ ''یہ گاڑی تو آگے نہیں جائے گی، میراں پور رک جائے گی۔''

''ہاں'' خاتون مسکرائی۔ ''میراں پور سے ڈبہ چلتا ہے جو انگوری جاتا ہے۔''

''تو آپ انگوری جائیں گی؟'' سانولی نے پوچھا۔

''انگوری، وہ کیا چیز ہے؟'' گوری نے پوچھا۔

''وہ اس پہاڑی کی چوٹی پر آباد ایک گاؤں ہے وہاں بیرنگٹن ریذیڈنٹ سکول ہے میں وہاں پڑھاتی ہوں۔''

''اوہ۔۔۔'' سانولی بولی ''تو آپ مس ہیں سکول ہی میں رہتی ہیں کیا؟''

خاتون نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''آپ کے میاں بھی ساتھ رہتے ہیں کیا؟'' گوری نے پوچھا۔

''اونہوں، خاتون بولی۔ ''وہ فوت ہو گئے، دیر ہوئی۔''

کچھ دیر کے بعد خاتون پھر بولی۔

''آپ پہلے کبھی ادھر نہیں آئیں کیا؟''

''نہیں'' گوری نے کہا۔

''کسی سے ملنے جارہی ہیں کیا؟''

''ہاں، ہماری سہیلی کی شادی ہے۔'' سانولی نے کہا۔

''یہاں میراں پور میں۔''

''ہوں''

خاتون برتھ سے نیچے اتر آئی۔ مسکرا کر بولی۔ ''لو میرج ہے کیا؟''

گوری اور سانولی دونوں نے ایک دوسری کو معنی خیز نظروں سے مسکرا کر دیکھا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ خاتون ان کے مقابل بیٹھ گئی اور بولی ''آج کل لڑکیاں اپنی مرضی سے شادی کرتی ہیں نا۔''

''اونہوں، سانولی نے کہا۔ ناٹ اسما، ماں دیر سے مرچکی ہے، باپ نے اسما اور تنویر کو پالا ہے۔ دوسری شادی نہیں کی۔ بیچاری باپ کے سامنے بول نہیں سکتی۔ چپ لگ جاتی ہے اندر چاہے ہنڈیا چڑھی رہے۔''

''ہنہ اندر کی ہنڈیا کو کون پوچھتا ہے۔'' گوری نے اپنے ہونٹ بٹوے کی طرح بنائے۔ صدیوں سے اندر ہی اندر سلگتی رہی ہے اب بھی اگر بھڑک کر نہ جلی۔''

''کون بھڑک کر نہ جلی؟''

''وومن اور کون۔'' گوری غصے میں بولی۔

''تو خود ذرا بھڑک کر جل کر دکھا تو مانیں، تُو بھی تو سلگ رہی ہے اندر ہی اندر۔'' سانولی نے کہا۔

''یو شٹ اپ۔''

''دیکھا اپنی بات نہ کرتی ہے نہ کرنے دیتی ہے۔'' سانولی بولی۔

''کوئی لوافیئر ہے کیا؟'' خاتون مسکرائی۔

''افیئر تو ابھی بنا نہیں، البتہ لو ضرور ہے، مدھم مدھم، کیا پتہ اس ٹرپ میں بھڑک اٹھے۔''

''بھئی یہ اس کا پرسنل میٹر ہے ہم اسے کیوں ڈسکس کریں۔''

''ڈسکس کریں تو بگڑتی ہے نہ کریں تو بگڑتی ہے۔''

گوری یہ سن کر مسکرا دی۔

"جس کی شادی پر جا رہے ہیں نا اس کا بھائی ہے۔"

"تنویر، لڑکا کیا ہے نرا اپو پٹ ہے۔" سانولی نے کہا۔

"سچ" خاتون گوری سے مخاطب ہو کر بولی۔ "از اٹ لو آن فسٹ سائٹ۔"

"اونہوں آج کل فسٹ سائٹ نہیں چلتی مس، پہلے پورا جائزہ لیا جاتا ہے، کوٹھی ہے؟ کار ہے؟ کمفرٹس ہیں؟ سب لوازمات پورے ہوں تو محبت پھوٹتی ہے، ویسے نہیں۔"

"واہ یہ اچھی محبت ہے، خاتون ہنسی "جو سوچنے کا موقعہ دیتی ہے۔"

"آپ کے دور میں سوچنے کا موقعہ نہیں دیتی تھی کیا۔"

"ہمارا کیوپڈ تو اندھا تھا۔۔۔"

"ہمارا تو چشمے لگائے بیٹھا ہے۔"

"مس، گوری نے خاتون کا ہاتھ تھام لیا۔" آپ کو محبت ہوئی تھی کبھی؟" ایک ساعت کیلئے خاتون گھبرا گئی پھر مسکرا کر بولی۔ "کون ہے جسے نہیں ہوتی۔"

"آپ کے دور میں ہر کسی کو ہوتی تھی کیا؟"

"تقریباً کسی کو مدھم مدھم، کسی کو طوفانی، مدھم مدھم زیادہ طوفانی کم کم۔"

"آپ کی مدھم تھی یا طوفانی؟" سانولی نے پوچھا۔

"میری" خاتون ہنسی، میری تو چپ چپ تھی۔"

"چپ چپ کیا مطلب؟"

"باجی بتا دو نا"، گوری نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بھرپور منت کی۔

خاتون نے ایک لمبی آہ بھری، بولی "اسے زبان نہ ملی بس گونگی رہ گئی۔"

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سانولی چلائی، کہ نہ وہ بولا نہ آپ بولیں۔"

"ہاں، خاتون نے کہا، نہ وہ بولا نہ میں بولی، لیکن اس کے بے آواز بولوں سے میرا وجود اس قدر بھر گیا تھا جیسے دانوں سے انار بھرا ہوتا ہے۔"

"بے آواز بولوں سے۔" سانولی نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں" خاتون نے خواب آلود انداز میں کہا۔ "جب زبان گنگ ہو جائے تو وجود کا انگ انگ زبان بن جاتا ہے۔"

"ہے باجی، گوری ان جانے اثر سے یوں بھیگی ہوئی تھی جیسے گھاس اوس سے، کیا گونگی محبت بھی ہوتی ہے۔"

"جتنی گونگی اتنی گہری، اتھاہ۔" خاتون نے پُرنم آنکھوں سے ڈبے کی چھت کی طرف دیکھا جیسے ڈرتی ہو کہ کچھ ٹپک نہ پڑے۔ گاڑی چھکا چھک چھکا چھک جا رہی تھی۔

تانبے کا تھال کچھ اور ڈھلک گیا تھا۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ دفعتاً ایک شور بلند ہوا، ڈبے میں اندھیرا چھا گیا۔

"ہائے اللہ، گوری نے چیخ سی ماری اور خاتون سے لپٹ گئی۔

"ڈر گئی، سانولی کی آواز آئی، "یہ تو سرنگ ہے۔"

گوری کی گرفت کے گرم دباؤ سے خاتون نے محسوس کیا جیسے وہ چھلکی ہوئی ہو۔ خاتون نے اُسے بھینچ لیا۔

"باجی ہمیں سناؤ نا، ساری بات سناؤ نا۔" گوری نے منت کی۔ خاتون کے دوسرے پہلو سے سانولی لپٹ گئی۔ "سناؤ نا ساری بات پلیز۔"

"ادھوری سی بات ہے۔" خاتون نے زیر لب کہا، "ساری ہوتی تو اتنی گہری نہ ہوتی۔"

"مدھم سے نقوش ہیں، پتہ نہیں کیوں مدھم ہو تو رنگ چھٹتا نہیں۔" خاتون نے ایک لمبا سانس لیا۔

"ان دنوں یونیورسٹی میں پانچویں سال میں پڑھتی تھی۔ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ ایک چھوٹا سا کیوبیکل تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ کام کی نہیں بے کار کتابیں پڑھا کرتی۔ افسانے، نظم سبھی کچھ اور کوئی شوق نہ تھا۔ کلاس میں ہوسٹل میں، کیمپس میں، ہر جگہ مدھم مدھم

ٹمٹماتی، بھڑک کر جلنا فطرت میں نہیں ویسے طبعیت میں جھجک نہ تھی۔ بات کہہ دیتی مدھم مدھم۔

میری سہیلیاں سبھی شوخ تھیں چنچل تھیں، توجہ طلب تھیں، وہ رنگدار تھیں دھاری دار تھیں، پھولدار تھیں، میں چٹ کپڑی تھی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں تھا۔ بس ابھر کر سامنے آنے کی دل میں امنگ نہ تھی۔"

"وہاں لڑکے بھی تھے؟" سانولی نے پوچھا۔

"ہاں لڑکے ہی لڑکے، لڑکے ہی لڑکے۔" لڑکوں کا ایک انبوہ تھا۔ وہ گروپس میں جیتے تھے۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو فرد بن کر سامنے آتا۔ ان دنوں لڑکے ایسے ہی تھے کیا جیسے آج ہوتے ہیں؟" سانولی نے پوچھا۔

متھے تو ایسے سوڈے کی بوتل کی طرح لیکن خالی خولی سوڈا آجکل تو نمک کی چٹکی پہ چٹکی انڈیلتے رہتے ہیں۔ ان دنوں لڑکوں کی لڑکیوں کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ لیکن دور ہی دور سے یا تو آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا دیتے۔ یا ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی بے بسی کا اظہار کرتے۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ ہے آجکل تو بوتل سے نکلے ہوئے جن کی طرح چھائے رہتے ہیں۔

سانولی بولی۔ ایک روز گروپ سٹڈی کے دوران لیٹریچر کے سر نے میرا جی کی اس کتاب کا تذکرہ کیا جو انہوں نے سنسکرت سے ترجمہ کی تھی۔ پتہ نہیں کیا نام تھا اُس کا۔۔۔۔۔ ہاں نگار خانہ، میں نے برسبیل تذکرہ کیا، میں نے نگار خانہ بہت ڈھونڈی لیکن ملی نہیں"۔ سر بولے۔ پبلشر سے منگوا لو۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنی سی بات کتنا بڑا اتھنگو بن جائے گی۔

اگلے دن جب میں بیدار ہوئی۔ جاگی۔ اٹھی انگڑائی لی۔ دفعتہً میری نگاہ کیوبکل کے دروازے پر جا پڑی کیا دیکھتی ہوں کہ دروازے کے قریب ایک کتاب پڑی ہے، ایک اجنبی سی کتاب۔ ارے یہ کہاں سے آئی۔ لپک کر اٹھی۔ دیکھا تو وہ میرا جی کی نگار خانہ تھی۔ میں تو حیران رہ گئی یہ کہاں سے آئی۔ میری سہیلوں کے پاس بھلا یہ کتاب کہاں۔ کسی نے

دروانے کی نچلی درز سے اندر پھینکی ہوگی۔ لیکن کس نے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سارا دن سوچتی رہی، سوچتی رہی، ساتھ آٹھ دن دل میں کتھر پتھر لگی رہی پھر مدھم پڑ گئی۔ کتاب پڑھی تو من میں دیئے روشن ہوگئے۔ توبہ اتنی وزڈم۔ لیکن کتاب کا بھید کھلا یا نہیں، گوری نے پوچھا۔

اونہوں الٹا وہ گھمبیر ہو گیا۔ اس واقعے کو ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ میری نوٹس کی کاپی گم ہوگئی۔ اس پر میں بہت ٹپٹائی، چیخی چلائی، کلاس میں اعلان کیا، ہوسٹل میں ہر لڑکی سے پوچھا، نوٹس بورڈ پر لکھ کر پرچا لگایا۔ لیکن کاپی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ سب کہا پھر سے لکھ لو۔ پھر سے لکھنے کا وقت کہاں تھا۔ سر پرٹسٹ کھڑا تھا۔ بے بس ہو کر رہ گئی۔ پھر ایک دن کالج سے لوٹی، دروازہ کھلا تو کیا دیکھتی ہوں سامنے کھڑکی میں ایک کاپی پڑی ہے۔ لپک کر اٹھائی۔ "وہی گم شدہ کاپی ہوگی۔" سانولی نے پوچھا۔

"نہیں، خاتون بولی، لیکن نوٹس وہی تھے جو مجھ سے گم ہوگئے تھے یا اللہ یہ کھڑکی میں کیسے آئی، ویسے تو کھڑکی ہوسٹل سے باہر لان کی طرف کھلتی تھی پر اس تو جالی لگی ہوئی تھی۔ دیکھا تو نیچے سے جالی کٹی ہوئی ہے، خاتون نے آہ بھری۔" چاہیئے تو تھا کہ نوٹس ملنے پر خوش ہوتی لیکن میں تو حیرت سے سن ہو کر رہ گئی۔ کیمپس میں اسٹوڈنٹ دل و جان نچھاور کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں مگر اپنے نوٹس نہیں دیتے۔" خاتون نے ایک لمبا سانس لیا اور خاموش ہو گئیں۔

گاڑی نچان کی طرف جارہی تھی چھکا چھک میں تھکاوٹ کی جگہ روانی نے لے لی تھی۔ آسمان پر تانبے کا تھال، کولڈر رنگ پچکاری بنا ہوا تھا۔ مغرب میں دھاریاں ہی دھاریاں رنگ کی دھاریاں مشرق سے منیار اندھیرا رینگ رہا تھا۔ ابھر رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں حیران بیٹھی تھیں۔ یہ لوا سٹوری ہے کہ مسٹری اسٹوری پتہ نہیں۔ وہ سراغ رساں کب آئے گا۔

"پھر باجی"۔ گوری نے جذبات سے گھگھی آواز میں پوچھا۔

"پھر۔۔۔۔ خاتون نے خواب آلود آواز میں دہرایا۔"

"پھر مجھے ہینڈ رائٹنگ کا خبط ہو گیا۔ گھنٹوں بیٹھی نوٹس کی کاپی کا ہینڈ رائٹنگ دیکھتی رہتی۔ لڑکے نوٹس لکھتے تو میں ان کے ہینڈ رائٹنگ کو پرکھتی"۔ "سب کچھ میری توجہ کے دائرے سے گویا باہر نکل گیا صرف ایک بات ایک خیال ایک دیوانگی رہ گئی۔ کون ہے؟ رات کو سوتے میں ڈر کر اٹھ بیٹھتی۔۔۔ کون ہے۔ بیٹھی بیٹھی ان جانے میں بول اٹھتی کون ہے؟ یہ الجھن ایسی لگی کہ بیمار پڑ گئی بخار، ورٹا نیگو، سردرد، بند بند میں درد، میرا سارا جسم اس بگلے پن پر احتجاج کرنے لگا۔ جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ گردے درد کرنے لگے دل دھڑ کنے لگا۔ ہوسٹل والوں نے مجھے کیمپ کی ڈسپنسری میں شفٹ کر دیا۔ خصوصی نرس کی ڈیوٹی لگا دی۔ وہ بیچاری گھبرا گئی اسمارا ساری رات آپ بے ہوشی میں پوچھتی رہتی ہیں کون ہے۔ یہ کون ہے۔۔۔ کون ہے۔۔۔ کون ہے۔ بات کیا ہے۔ "اب میں اُسے کیا بتاتی، چپ ہو رہی۔

جب بخار ٹوٹا ایک دن بیڈ پر تکیے سے سہارا لگائے بیٹھی تھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ سامنے میز پر بوتل کے سہارے ایک کارڈ کھڑا ہے، گٹ ول پلیز، پھر وہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کارڈ کس نے رکھا۔ میں نے نرس سے پوچھا۔ "پتہ نہیں" وہ بولی۔

"یہاں کون کون آتا ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"سبھی آتے ہیں، لڑکے، لڑکیاں، شہری۔" اگلے روز ایک نیا کارڈ کھڑا تھا۔ گٹ ول اسمارا"۔ اپنا نام دیکھ کر میرا جی چاہا کہ کسی کے گلے لگ کر رو دوں۔ اتنا روؤں اتنا روؤں کہ ساری کی ساری آنسو بن کر بہہ جاؤں۔ حد ہو گئی، سانولی بولی۔

"کسی لڑکے کی نگاہوں نے نہ کہا میں ہوں میں"۔

"اونہوں، میں نے ٹوہ لگانے کی بڑی کوشش کی، میں جو عادتاً نگاہوں سے بچا کرتی تھی میں نے نگاہوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ رویوں پر نظر رکھنے لگی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر میں نے احتیاط برتنی شروع کر دی کہ محفل میں باآوازِ بلند کسی آرزو کا اظہار نہ کروں۔

"وہ کیوں"؟ سانولی نے پوچھا۔

"توبہ ان دنوں میں یہ سمجھنے لگی تھی کہ میرے ہونٹ الہ دین کا چراغ ہیں جو کچھ منہ

سے کہتی وہ پورا ہو جاتا۔ صرف فرق یہ تھا کہ جن سامنے نہیں آتا تھا۔

"کیا کلاس میں کوئی جن نہ تھا"۔ سانولی نے کہا۔

"جن تو تھے"۔

"وہ تو مانے ہوئے جن تھے، ایک تو سمیع تھا دوسرا خلیل۔ دونوں ہی بڑی تند قسم کی چیزیں تھیں۔ بات بات پر بھڑک، اٹھتے۔ ہاتھا پائی پر اتر آتے۔ خواہ مخواہ دوسروں پر دھونس جماتے لیکن ان کا یہ رویہ صرف لڑکوں کیلئے مخصوص تھا۔ لڑکوں میں وہ دونوں غنڈے تھے۔ لیکن لڑکیوں کے سامنے آتے تو نگاہیں جھکا لیتے، عجز سے بات کرتے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خدمتوں پر کمر بستہ رہتے۔ کوئی ان سے بد اخلاقی کرتا تو اسے پیٹ کر رکھ دیتے۔ دراصل وہ لڑکیوں کو کیمپس کی عزت سمجھتے تھے جس طرح غنڈے محلے کی عورتوں کو محلے کی عزت سمجھتے ہیں۔

"سچی بات یہ ہے کہ ان کی خوش اخلاقی کے باوجود ہم لڑکیاں ان سے ڈرتی تھیں۔ خاتون نے مسکرا کر کہا۔ پھر ایک دن جب کالج گرمی کی چھٹیوں کیلئے بند ہو رہا تھا سبھی گھر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے میں لائبریری کی کتابیں لوٹانے کیلئے جا رہی تھی۔ تو لیٹریچر ونگ کے سامنے لڑکوں کا مجمع لگا دیکھ کر میں رک گئی۔ خلیل کے ہاتھ میں ایک پوسٹر تھا جو وہ بورڈ پر چسپاں کر رہا تھا۔ دفعتہً سمیع گرجا خلیل ڈونٹ ڈو اٹ"۔ خلیل نے سمیع کی گرج کی پروا نہ کی۔ خلیل، سمیع پھر گرجا۔ "آئی سی ڈونٹ"۔ خلیل اور سمیع دونوں گہرے دوست تھے ان کے درمیان کبھی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ پہلی بار یہ منظر دیکھ کر لڑکے حیران تھے۔

"سٹاپ اٹ پلیز۔ سمیع چلائی۔ اس کے پلیز میں خفت تھی۔

"کیوں تیری چلتی ہے اس لئے"۔ خلیل نے تمسخر سے کہا۔ اس پر سمیع نے جنگلی بھینسے کی طرح جست لگائی۔ خلیل کے ہاتھ سے پوسٹر نوچ کر پرے پھینک دیا اور تابڑ توڑ گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ وہ پوسٹر میرے قدموں میں آ گرا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھے بغیر طے کر کے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ اُدھر سمیع نے خلیل کا پلتھن بنا دیا۔ اُس کا منہ

خون نے رنگا گیا۔لڑکے اُسے اٹھا کر کیمپس کی ڈسپینسری میں لے گئے۔سمیع میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ نگاہیں جھکی ہوئیں تھیں۔گردن لٹکی ہوئی۔ رک رک کر بولا۔''مجھے معاف کر اسارا، میں شرمندہ ہوں''۔ میں حیران تھی یہ مجھ سے معافی کیوں مانگ رہا ہے۔دراصل اُس وقت میرے تن بدن میں سمیع کے خلاف غصے کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں تو یہ اتنا وحشی پن۔ میں نے جواب دیئے بغیر منہ موڑ لیا اور لائبریری کی طرف چل پڑی۔رات کو جب میں سونے لگی تو سر درد کی گولی کھانے کیلئے میں نے بیگ کھولا۔ پوسٹر کو دیکھ کر مجھے سارا واقع از سرِ نو یاد آ گیا۔ میں نے پوسٹر کھولا اُس پر میرا کارٹون بنا ہوا تھا۔ نیچے لکھا ہوا تھا''چٹ کپڑی''۔دفعتہً میری نگاہ سے جیسے پردہ ہٹ گیا۔خلیل کے خلاف وہ گھن گرج اور میرے سامنے گردن لٹکا کر مجھے معاف کر دو پلیز۔''تم سمیع میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔''اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خاتون خاموش ہو گئی۔گاڑی سیٹیاں مار رہی تھی۔ نیچے وادی میں چراغ ٹمٹمار ہے تھے۔تانبے کا تھال اپنی رنگ دار دھاریاں سمیٹ کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔دفعتہً گاڑی نے دھکا کھایا اور پھر رک گئی۔ارے یہ تو میرا پور آ گیا۔ سانولی چلائی۔

''باجی پھر کیا ہوا''؟ گوری نے سامان اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''پھر کچھ بھی نہیں۔'' خاتون نے آہ بھر کر کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔''

''گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد وہ ملا ہوگا نہ''۔سانولی بولی۔

''گرمی کی چھٹیوں کے سمیع کالج آیا ہی نہیں۔''

''کیا کہا'' وہ دونوں چیخیں۔

''کیمپس ڈسپلن کمیٹی نے اُسے ارسٹیکیٹ کر دیا تھا۔خاتون نے جواب دیا۔

''پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی''؟ گوری نے پوچھا۔

''اونہوں، کبھی نہیں''۔ خاتون نے مدھم آواز میں کہا۔عین اُس وقت ڈبے میں

ایک نوجوان داخل ہوا،''کہاں ہو تم اسی، اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔دو ایک ساعت تو خاتون حیرت سے تنویر کی طرف دیکھتی رہی اُس کی نگاہ میں سب کچھ دھندلا گیا اور جیسے نیم مدہوشی میں مدھم آواز میں چلائی۔

''تم سمیع اور پھر سیٹ پر ڈھیر ہوگئی۔

اگلی صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی کمرے میں پا کر خاتون حیران رہ گئی۔ پھر اُس نے دیکھا کہ سرہانے سانولی اور گوری بیٹھی ہیں۔ اُس کے ذہن میں بیتے ہوئے واقعات تازہ ہو گئے۔ بولی مجھے انگوری جانا ہے پلیز مجھے انگوری پہنچا دو''۔

''آیئے میں کب سے منتظر ہوں خاتون''۔ ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔ خاتون نے مڑ کر دیکھا۔ بیڈ کے پیچھے تنویر کا باپ کھڑا تھا آنکھیں جھکی جھکی، گردن لٹکی ہوئی۔ ہماری وجہ سے آپ کو ناحق زحمت ہوئی۔ وہ بولا،''مجھے معاف کر دیجئے خاتون میں شرمندہ ہوں۔''

''تم سمیع، خاتون نے مدھم سی چیخ ماری اور پھر سے بستر پر ڈھیر ہوگئی۔

سائیں حلوہ

اپر بازار میں خوفناک خاموشی طاری تھی ۔ ویلی ویو ہوٹل کے تمام بیرے باہر برآمدے میں بت بنے کھڑے تھے وہ مقابل کے چوگان کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پینٹری میں مسلسل کال بل بجے جارہی تھی۔ .کوئی نہیں سن رہا تھا۔

ہوٹل کا منیجر البرٹ خود کھڑکی میں کھڑا ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہا تھا۔ ڈے بک سامنے کھلی پڑی تھی قلم ہاتھ میں تھا اور مونچھ گری ہوتی تھی۔ لیکن اسے کچھ خبر ہی نہ تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

ہوٹل کی تیسری منزل پر ایمی کھڑکی میں یوں بیٹھی تھی جیسے پتھر کی بن گئی ہو۔ اون کا گولا ٹوکری سے نکل کر نہ جانے کدھر لڑھک گیا تھا۔ سلائیاں گود میں گری ہوئی تھیں۔ ایمی کے پیچھے شارو انگڑائی کی صورت کھڑی تھی۔ اسوقت شارو آنکھیں مٹکانا اور مسکانا بھولے کھڑی تھی۔

ہوٹل کے مقابل کے ٹیلے پر ایمی کی کھڑکی کے سامنے شہزاد منہ موڑے اپر بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایمی کھڑکی میں بیٹھی اور شہزاد کسی اور طرف دیکھے ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ہوٹل کا سارا اسٹاف سمجھتا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا تو حیرت سے انکی آنکھیں ابل آتیں۔ لیکن وہ تو سب اپر بازار کی طرف دیکھنے میں محو تھے۔ شہزاد سائیں کا نعرہ سنتا تو اسے ایسے لگتا جیسے سائیں صرف اس سے مخاطب ہو۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ اتنا لمبا چکر کاٹ کر صرف اسے احساس دلانے کیلئے وہاں آتا تھا۔ جیسے وہ اپنے نعرے اور قہقہے سے اسے جھنجھوڑنا چاہتا ہو۔

خصوصاً جب سائیں ہوٹل کے مقابل کے میدان میں پہنچتا تو وہ بار بار شہزاد کی

طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا۔ اسوقت ایمی اور شہزاد دونوں محسوس کرتے کہ سائیں ان دونوں سے مخاطب ہے۔ اسوقت سائیں کے انداز میں دیوانگی کی بجائے فرزانگی جھلکتی۔

وہ دونوں سمجھتے کہ سائیں ان کے بھید سے واقف ہے۔

وہ رات خالی متکلم ہی نہ تھی۔ بڑی خوفناک بھی تھی۔ البرٹ ایک پھوڑا بنا بیٹھا تھا۔ سامنے پلکوں کی نشتر ٹنگے ہوئے تھے۔ اسکے دل میں خوفناک ارادے بندھ رہے تھے۔

اس رات ایمی نے اون اور سلائیاں اٹھا کر رکھ دی تھیں۔ اسنے محسوس کیا تھا کہ وہ آرام کرسی میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اسکے اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اندر پلنگ پر شارو یوں ٹوٹی ہوئی پڑی تھی جیسے پلاسٹک کی گڑیا کو جوڑ کر رکھنے والا ایلاسٹک ٹوٹ گیا ہو۔

دفعتاً ایمی چلتے چلتے رک گئی۔ شارو وہ چلائی شارو فون پر البرٹ سے کہو کوئی آدمی بھیج کر شہزاد کو بلوادو۔ کہنا میڈم نے بلایا ہے۔

ایٹ یور کال میڈم۔ شہزاد نے سیڑھیوں سے سر نکال کر کہا۔

ایک ساعت کیلئے ایمی ٹھٹک کر رہ گئی۔ پھر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

آیئے شہزاد صاحب تشریف لایئے۔ نارگھٹن میں سیاح جن کی تعداد موسم گرما میں دس ہزار تک جا پہنچتی ہے، تیس پینتیس ہوٹل اور ریسٹ ہاؤس ہونگے دس بارہ مغربی طرز کے باقی پاکستانی، دو لوئر بازار میں دو اپر بازار میں۔ لوئر بازار سے نیچے مقامی باشندوں کے مکانات ہیں۔

اس علاقے میں کئی ایک گلیات ہیں لیکن بارگھٹن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

پتہ نہیں کیوں منظر تو ایسا ہی ہے جیسا پہاڑی مقامات پر ہوتا ہے آب و ہوا بھی ویسے ہی خوشگوار ہے ہاں ایک انفرادی خصوصیت ضرور ہے جوں جوں وہاں خوشگواری کا احساس بڑھتا ہے توں توں ایک بے نام گھٹن ابھرتی ہے جو بند بند میں لہراتی ہے۔ پیچ و تاب کھاتی ہے۔ گرہیں ڈال دیتی ہے۔ بالکل کنول کے پودے کی طرح۔ سطح آب سے اوپر جوں جوں پھول کھلتے ہیں نیچے جڑوں کے ڈنٹھل پیچ و خم کھا کھا کر گرہیں بنتے چلے جاتے ہیں۔

شاید اسی خصوصیت کی وجہ سے اسکا نام نارگھٹن رکھا گیا ہو۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جگہ پہلے ایک آتش فشاں دہانہ تھی۔ جہاں سے ہر وقت آگ کی لاٹوں کے فوارے نکلتے رہتے تھے۔ اب آگ نیچے دب گئی ہے۔

لوگ نارگھٹن میں صحت افزائی کیلئے آتے ضرور ہیں لیکن رکتے ہیں تو خوشگواری کے لئے نہیں بلکہ گھٹن کیلئے اور ویسے بھی صحت دھن و دولت کی طرح ہوتی ہے ضرورت سے زیادہ مل جائے تو گرہیں پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہ گرہیں کھولنے سے کھلتی نہیں الٹا دل میں ڈر پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں کھل نہ جائیں۔

ہوٹل کا منیجر البرٹ بھی تو وہاں صحت افزائی کیلئے آیا تھا، اور پھر اسے اتنی صحت مل گئی کہ وہ گھٹن بن گئی اور اس گھٹن کی لذت نے اسے اسقدر اپاہج بنا دیا کہ وہاں سے چلے جانا ممکن نہ رہا۔ سچ پوچھو تو یہ قیامت ایمی کی اٹھائی ہوئی تھی۔ لیکن ایمی کو دیکھو تو گویا اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ وہ آرام کرسی پر مرا پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے آکر کہا دل کا دورہ تھا۔

ساور کر کی موت پر سارے لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں اب ایمی کیا کرتی ہے۔ کئی ایک دن سب کی آنکھیں ایمی پر لگی رہیں لیکن ایمی نے کچھ بھی نہ کیا۔ پلکیں تک نہ اٹھائیں۔ البتہ کھڑکی میں بیٹھنے کی بجائے وہ ٹیریس پر ٹہلتی رہی، ٹہلتی رہی، مسلسل دو دن ٹہلتی رہی۔ پھر وہ چپکے سے نیچے اتری۔ پروپرائیٹرز روم کھولا۔ گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر کال بل بجائی۔

بل کی آواز سنکر البرٹ دوڑا دوڑا آیا۔ ایمی کو دیکھ کر بے ساختہ اسکے منہ سے نکلا

"میڈم آپ؟"

ایمی بولی منیجر صاحب بکس لے آئیں۔ کچھ اس انداز سے بولی جیسے سالہا سال سے ہوٹل کی منتظمہ ہو۔ جیسے حساب کتاب کرنا اسکا روز کا کام ہو۔

بس اسکے بعد ایمی یوں ہوٹل کی نگرانی کرنے لگی جیسے روز اول سے یہی کام کرتی آئی ہے۔ بیچارہ البرٹ بالکل بوکھلا گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قرب پر خوشی سے

چٹکیاں مارے یا اس دوری پر آنسو بہائے۔ جو قرب پر ناگ بن کر پھن پھیلائے ہوئے تھی۔
بہر طور ایک بات پر وہ خوش تھا کہ اب وہ درد دل کا اظہار تو کر سکتا تھا۔

ایک دن اسنے اظہار کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ دو تین منٹ مسلسل وہ عشق کا اظہار کرتا رہا۔ بے بسی محبت خلوص انتظار تنہائی شادی۔

ایمی نے ساری بات خاموشی میں سنی تھی اور آخر میں ڈے بک آگے بڑھاتے ہوئے بولی تھی۔ منیجر صاحب اس صفحے پر تین غلطیاں ہیں۔ انہیں ٹھیک کر لیجیے۔ مینو میں چار ایک کانٹی نینٹل کھانوں کا اضافہ کر دیجئے اور یاد رکھیے آئندہ سے اس ہوٹل میں دیسی شراب سرو نہ کی جائے۔ آپ سمجھ گئے۔

دیسی شراب سرو نہ کی گئی تو خسارہ رہے گا میڈم البرٹ نے جواب دیا۔

''پڑا رہے۔'' وہ بولی۔ ''اب آپ جا سکتے ہیں منیجر۔''

اس روز البرٹ کو پتہ چل گیا تھا کہ اسکے جاگتے سپنے محض دل بہلاوا ہیں۔ اس تلخ حقیقت کو بھلانے کیلیے وہ از سر نو جاگتے سپنوں میں مزید شدت سے کھو گیا تھا۔

شہزاد سپنوں میں پناہ ڈھونڈنے کا قائل نہ تھا۔ اسمیں ایک والہانہ جھپٹ تھی ویسے کہنے کو تو اسے بھی ایمی نے کہا تھا۔ یو گٹ آؤٹ آف ہیر مسٹر۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ساور کر زندہ تھا اور ایمی کے کہنے کے مطابق اسنے ایمی کی کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے موٹے کاغذ لگا دیے تھے۔

بعد از دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں صرف ایمی اور شارو تھیں۔ شہزاد کو داخل ہوتے دیکھ کر دونوں حیران ہوئیں۔ شہزاد نے انکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا وہ سیدھا اندر داخل ہو گیا اور اس کمرے کی طرف بڑھا جسکی کھڑکی میں ایمی بیٹھا کرتی تھی۔

ایمی نے مژگاں اٹھائیں۔ اے مسٹر وہ بولی گٹ آؤٹ آف ہیر۔ شہزاد نے پہلی مرتبہ آنکھوں سے پردے اٹھے ہوئے دیکھے۔ ان ڈولتی آنکھوں نے اسے گڈی کر دیا۔ غالباً اسنے الفاظ سنے ہی نہیں تھے۔

پھر شارو تن کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ چلا جا نہیں تو۔

شہزاد نے شارو پر بھرپور نظر ڈالی بولا ''ہٹ جا نہیں تو۔''

شارو منیار تھی۔ اسے اپنے پر بھروسہ تھا۔ بولی ''نہیں تو کیا۔''

شہزاد نے جھپٹ کر اسے دونوں بازوں میں اٹھا لیا۔ اور پھر ہونٹوں اور ہاتھوں سے مل کر یوں بستر پر پھینک دیا جیسے پھول کو مسل کر پھینکا ہو۔ پھر وہ ایمی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور کھڑکی کی پیچھے لگے ہوئے کاغذوں کو نوچ نوچ کر اتارنے لگا۔ پچھلے دروازے میں ایمی کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ مژگاں گویا تھی ہی نہیں۔

کاغذ پھاڑنے کے بعد وہ مڑا۔ اور ان ڈولتی آنکھوں والی سے بولا۔ اگر تو نے پھر کاغذ لگائے تو میں آکر شیشے توڑ دوں گا۔ تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ یہ کہکر وہ زینہ اترنے لگا۔ اسکے جانے کے بعد شارو آہستہ آہستہ کراہنے لگی۔ اسکی کیفیت میں تکلیف کم تھی لذت زیادہ تھی۔ ایمی کی آنکھوں میں ہلکا سا تبسم تھا۔

دوسری مرتبہ شہزاد اور ایمی کی ملاقات ساور کر کی وفات سے کافی دن بعد ہوئی اس وقت وہ پروپرائیٹرز روم میں بیٹھی کام کر رہی تھی اسنے پچھلے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی۔ سمجھی شاہد منیجر ہے۔

شہزاد اسکے مقابل کی کرسی میں آ بیٹھا۔ شہزاد کی موجودگی کا احساس کر کے وہ جھکی جھکی آنکھوں سے بولی۔ ''وہاٹ ڈو یو وانٹ مسٹر۔''

''آئی وانٹ یو'' ۔ وہ بولا۔ ''آئی ویل میری یو۔''

''آپ مہربانی کر کے چلے جائیں۔'' وہ بولی۔

''چلا جاؤں گا، بس میری بات کا جواب دے دے تو مجھ سے بیاہ کرے گی یا نہیں۔'' وہ خاموش رہی۔

''جواب اس لئے نہیں دیتی کہ میں پیچھا کرنا نہ چھوڑوں، ہے نا۔''

اسنے تڑپ کر مژگاں اٹھا کر دیکھا۔

"جب تک جواب نہ دیگی میں پیچھا کروں گا۔"

وہ پھر چپ ہوگئی۔

"ایمی" وہ بڑے پیار سے بولا۔ "کب تک اکیلی رہے گی تُو کب تک گھٹن بن کر جیئے گی۔"

"پلیز گو اوے" وہ چلائی۔

"پلیز مجھے اپنا لو" وہ مسکرایا۔

ایمی نے کال بل کا بٹن دبا دیا۔ کمرے پر خاموشی طاری رہی البرٹ داخل ہوا۔ شہزاد کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ البرٹ دو کوک بھیج دو۔ شہزاد نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

یس میڈم وہ بولا۔ اور باہر نکل گیا۔ "میں تیری ہر شرط مانوں گا ایمی"۔ شہزاد نے کہا۔ "میں فیوڈل ہوں ایمی، فیوڈل کسی کو نہیں اپناتا، اپنا لے تو نبھاتا ہے۔ تو سوچ لے پھر مجھے خود بلا کر اپنا فیصلہ سنا دینا۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ بولا "ایک دن تو مجھے بلائے گی، خود بلائے گی، اپنا فیصلہ سنانے کیلئے، اور یاد رکھ تو مجھے نہ نہیں کر سکتی۔"

البرٹ دو کوک کا ٹرے پکڑے داخل ہوا۔ تھینک یو البرٹ۔ شہزاد نے ایک کوک اٹھا لیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تیسری مرتبہ وہ اس سے اس رات ملا جس رات نارگھٹن مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھناتی رہی تھی اور آبادی کے سب لوگ بار بار حیرت سے کہتے، سائیں نے حلوہ کیوں کھایا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن معافی چاہتا ہوں۔ سائیں کی بات تو ابھی تک میں نے بیان ہی نہیں کی۔

سائیں ایک جوان آدمی تھا پتہ نہیں وہ کہاں سے آیا تھا۔ چار ایک سال ہوئے کہ ایک روز وہ اپر بازار میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔

شادی المرگ

"وہ سامنے گُرزر پڑا ہے نا" طفیلے نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ۔۔۔!"

اسمٰعیل نے آنکھیں اٹھائیں، انہیں مَلا دیر تک دیکھتا رہا پھر آنکھیں جھکا لیں۔ لیکن جواب نہ دیا۔

"وہاں تک کھدائی ہوگی۔" طفیلے نے بات پوری کی پھر وہ خاموش ہوگئے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ریت کی وہ چندھیا دینے والی چمک ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مطلع گرد آلود تھا تا حدِ نظر ریت ہی ریت لہریں لے رہی تھی اُداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دیر کے بعد اسمٰعیل بولا۔ "طفیلے۔" اُسکی آواز نم آلود تھی۔

"ہاں، کیا کہتا ہے؟" طفیل نے پوچھا۔

"میری آنکھیں دھندلا گئی ہیں طفیلے! صاف دکھتا نہیں۔"

"تو ڈاکٹر کو دکھا۔ نا۔"

"کبھی شہر جاؤں تو دکھاؤں نا۔ ویل ہی نہیں ملتا۔"

"یہاں اپنا ڈاکٹر جو ہے کمپنی کا۔"

"نہیں طفیلے کمپنی کا ڈاکٹر نہیں۔"

"کیوں؟"

"اگر اُس نے مجھے اَن فٹ کر دیا تو!"

"ہاں، طفیلے نے آہ بھری۔ ٹھیک کہتا ہے تُو کتنے سال ہوئے تجھے یہاں خادم میں کام کرتے"۔

"یہ چھبیسواں سال ہے۔"

''وطن کب گیا تھا؟''

''تین سال ہو گئے۔''

''چھٹی ملی تھی تجھے دو سال بعد۔''

''ہاں ملی تھی۔''

''تو کیوں نہ گیا تو۔''

''ماں نے لکھا تھا پیسہ چاہے اوبرٹیم کرتا رہا۔''

''ہاں! طفیلا ہنسا۔ انہیں پیسہ چاہے صرف پیسہ۔''

''نہیں نہیں۔'' اسمٰعیل چلایا۔ ''تجھے نہیں پتہ طفیلے ماں نے بڑے دکھ سہے ہیں۔ سارے پنڈ کی کامی بنی رہی ساری عمر گھر گھر کا کم کیا ہے اسنے۔''

''اور تیرا باپ؟'' طفیل نے پوچھا۔

میں نے باپو کو نہیں دیکھا۔ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا پہلے ہی۔''

وہ دونوں پھر سے خاموش ہو گئے۔ شام کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ گھسمسہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اُداسی اور بھی گاڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ دفعتاً طفیل بولا۔ ''اسمٰعیلے تیری بات اور ہے، پر تو جان لے۔ وہ سب پیسے کے گاہک ہیں پیسہ بجھو پیسہ بجھو۔ وہ اپنے چاؤ پورے کر رہے ہیں۔''

''وہ کون؟'' اسمٰعیل نے پوچھا۔

''جنہیں ہم اپنے کہتے ہیں، وہ، انہیں نہیں پتہ کہ یہاں ہم پر کیا بیت رہی ہے انہیں نہیں پتہ یہاں خادم میں رہنے کا کیا مطلب ہے۔ انہیں کچھ بھی نہیں پتہ، اور پتہ ہو بھی جائے اسمٰعیلے تو وہ یہ نہیں کہیں گے۔ دفعہ کرو چھوڑ دو گھر آ جاؤ۔ یہاں روکھی سوکھی کھا لینگے۔ اونہوں کبھی نہیں۔'' وہ جوش میں آ گیا۔ ''اب روکھی سوکھی ان کے گلے سے نہیں اترتی۔''

''نہیں نہیں۔'' اسمٰعیل نے اسے ٹوکا۔

''تجھے نہیں پتہ اسمٰعیلے!'' وہ بولا ''ایک بار گلا تر ہو جائے تو پھر روکھی سوکھی نہیں اترتی۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں تیری نہیں۔ تیری بات اور ہو گی۔ کیا پتہ اور ہی ہو پر سارے ہی اپنے

ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ نہ انہیں رہے کب ہم پر وطن لوٹیں تو سکھی رہیں۔ اونہوں وہ تو گنوا رہے ہیں اپنے شوق پورے کر رہے ہیں۔''

''تجھ میں بھروسہ نہیں کیا؟ طفیلے!'' اسمٰعیل نے پوچھا۔

''تھا'' وہ بولا ''بہت تھا، تیرے جیسا تھا پر اب نہیں ہے۔''

''اب کیوں نہیں ہے۔''

''اسلئے کہ اب میں تیسری بار یہاں آیا ہوں۔ پہلے دو بار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہاں گیا تو کوئی مجھے دیکھ کر راضی نہ ہوا تھا کوئی خوش نہ ہوا تھا۔ سب کے منہ لمبے ہو گئے تھے تو کیوں آ گیا۔ کیوں آ گیا ہے گھر والی کا منہ سوج گیا چاچے عقل سمجھانے لگے۔ بس اک چھوٹی بہن تھی جو خوش تھی۔ بیچاری اپنی خوشی چھپائے بیٹھی تھی کہ میری گھر والی نہ دیکھ لے۔''

''کیوں تیرے گھر والی کیا کہتی ہے۔''

میرے گھر والی بڑی چاتر ہے بڑی چالاک ہے۔''

''نہیں نہیں۔'' اسمٰعیل بولا ''گھر والیاں تو جان دیتی ہیں۔''

''دیتی ہے دیتی ہے۔'' طفیل بولا۔ ''وہ بھی جان دیتی ہے۔''

''تو پھر؟'' اسمٰعیل ہنسا۔

''جان دیتی ہے جب تک اسکی جھولی بھرتے رہو، تب تک، چوگا بند ہو جائے تو ٹھونگے مارتی ہے۔''

''بہت غصہ ہے تجھے اپنی گھر والی پر۔'' اسمٰعیل نے کہا۔

''ہاں بہت ۔۔۔'' طفیل بولا۔ ''پر جب اسکے سامنے جاتا ہوں تو پتہ نہیں کیا کر دیتی ہے سارا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔''

اسمٰعیل ہنسا۔ زیر لب بولا۔ ''گھر والی کا بڑا انگ ہوتا ہے طفیلے بڑا انگ ہوتا ہے۔''

''ہاں دور رہو تو بڑا انگ رہتا ہے۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔ ''چلو ڈیرے پر چلیں۔'' وہ دونوں چل پڑے۔ سامنے اینٹ اور پتھر کا ادھ بنا کارخانے کا ڈھانچہ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ بائیں ہاتھ

لمبی بارک میں مزدوروں کے ڈیرے تھے۔ یہاں وہاں ٹیڑھے میڑھے لکڑی کے کھمبوں پر بتیاں ٹمٹما رہی تھیں جو اندھیرے کو اور بھی اداس بنا رہی تھیں۔ بارک کے ارد گرد لوگ چپ چاپ چل پھر رہے تھے جیسے مر کر بدروحیں بن چکے ہوں۔

بارک کے قریب پہنچ کر طفیل رک گیا بولا ''دیکھ اسمٰعیلے یہ بات کسی اور سے نہ کرنا۔''

''کونسی بات؟'' اسمٰعیل نے پوچھا۔

''اپنی آنکھوں کی بات۔'' وہ زیرلب بولا۔ ''اسمٰعیلے تجھے نہیں پتہ یہاں بڑا بڑا جاسوس پڑا ہے۔''

اُس روز رحمت بی بی کے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس روز وہ پرانی بات ہی نہ تھی جو عام طور پر ہوا کرتی تھی۔ وہ شور شرابا ہی نہ رہا تھا۔ ورنہ رحمتے کی آواز تو ہر وقت گھر میں گونجتی رہتی تھی۔ کبھی وہ اپنے چھوٹے بیٹے اطا پر برستی ''وے اطے یہ تو نے پھر فرج کھولا، پھر بوتل نکالی۔ دن میں کتنی بوتلیں پیتا ہے تُو بس بھائی بہن دونوں تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کب موقعہ ملے اور کوک نکالیں۔ پتہ نہیں اس گڑ پانی میں کیا رکھا ہے۔ کہتے ہیں اماں روٹی دو نہ دو بس اک کوک دیدو۔ پتہ نہیں بنانے والوں نے کیا ڈالا ہے اسمیں اور تو اور وہ چھوٹا ٹاٹا جو ہے وہ بھی بوتل دیکھ کر ضد کرنے لگتا ہے۔ کو۔ کو۔ چیختا ہے پتہ نہیں کیا ڈالا ہے اسمیں۔ مجھے تو گڑ پانی دکھتا ہے۔۔۔ بھائی بہن دونوں کی منتیں کرتی ہوں کہ دودھ پیو گھر کا خالص دودھ ہے۔ کوئی تمہاری جان بنے۔ تو بہ ہے جی ہاتھ نہیں لگاتے۔ کہتے ہیں بو آتی ہے۔ لو سن لو یہ آجکل کے جو ہیں انہیں دودھ میں سے بو آتی ہے۔ چاچے رحیمے نے کہا بھی جو دودھ میں سے بو آتی ہے تو اسمیں چاکلیٹ ڈال لیا کرو۔ مینگو ڈال کر شیک بنا لیا کرو۔ وہ شیک کی مشین جو پڑی ہے وہ تو اللہ ماری خالی لسی کے لئے رہ گئی ہے۔۔۔۔ ہئے اس گھر میں اب کوئی لسی کو بھی منہ نہیں لگاتا۔ سارے پنڈ میں ونڈنی پڑتی ہے مجھے۔ مکھن بھی تو نہیں کھاتے ہے نا تماشہ گھر کا سچا مکھن چھوڑ کر ڈبے والا مکھن کھاتے ہیں کہتے ہیں گھر کے مکھن سے

او چھان آتی ہے۔ اور وہ جو چاناں ہے وہ کہتی ہے، اماں دودھ مکھن کھاؤں گی تو موٹی ہو جاؤں گی۔۔۔ سکی چرکھ ہے۔ اللہ ماری ہڈیاں ہی ہڈیاں منہ پر ہلدی ہی ہلدی ذرا لال نہیں کچھ کھائے پیئے تو منہ پر رونق آئے نا۔ بس چاء ہو کافی ہو کوک ہو اللہ اللہ خیر سلا۔ میم بنی پھرتی ہے کہتی ہے اماں مجھے چاناں نہ کہا کر۔ سکول میں مجھے سب چینی کہتے ہیں۔۔۔ لو کہاں چاناں کہاں چینی۔۔۔ کوئی تک ہے۔ ان آجکل کی لڑکیوں کا پتہ بھی چلے۔

رحمتے کی عادت ہی ایسی تھی وہ ہر وقت بولتی رہتی تھی۔ کبھی اسمٰعیل کی بیوی زبیدہ کو ڈانٹتی ''نی زبیدے تو کیا ہر وقت گم صم ہو کر بیٹھی رہتی ہے۔ منہ میٹی لاچی کی طرح۔ نہ گل نہ بات۔ تجھے کیوں سوگ لگا ہے۔ حوصلا کر آجائیگا، آجائیگا۔ تیرے ہی بچوں کے گلے تر کرنے گیا ہے۔ میرا کیا ہے میں کیا ساری زندگانی یہاں بیٹھی رہوں گی۔ آج مری پرسوں تیجا۔ تیرے ہی کام آئے گا۔ یہ گھر بار۔ یہ لٹرپٹر مشیناں جو یہاں اس گھر میں رُل رہی ہیں۔ یہ فریزر فرج۔ ٹی وی۔ وی سی آر۔ پتہ نہیں کیا کیا اندر ڈھیر کر رکھا ہے پرتُو تو بسورتی ہی رہتی ہے۔ گھر والا چلا جائے تو جان نکل جاتی ہے تیری۔ اک ہم تھیں ساری عمر اکلاپے میں گزار دی۔''

اس سے فارغ ہوتی تو صوبہ آجاتا۔ آ کر کہتا ''بی بی جی جانا کھوکھے والا کہتا ہے نو سو بائیں روپے ہوگئے ہیں۔'' یہ سنکر رحمت بی بی سر پیٹ لیتی۔

''دیکھ لے صوبے! یہ سب اڑا رہے ہیں۔ اڑا رہے ہیں جیسے مفت کا مال ہو کبھی اللہ مارے بسکٹ آرہے ہیں کبھی منہ پر ملنے والی کریمیں، کبھی کافی کے ڈبے اور کوک کا تو کریٹ پر کریٹ آتا ہے۔ ساتھ ٹافیاں گولیاں پتہ نہیں کیا کیا۔ سب عیش کر رہے ہیں میرے پتر کی کمائی پر اور وہ بیچارا وہاں پردیس میں خوار ہو رہا ہے اوبرٹیم کرتے کرتے پتہ نہیں کیا حال ہو چکا ہے اسکا پر اسکی کسی کو خبر نہیں کسی کو اسکا درد نہیں۔ بس آپادھاپی پڑی ہے یہاں۔ جس کا جی چاہتا ہے جو جی چاہتا ہے جا کے کھوکھے سے منگوا لیتا ہے۔ مجھ سے نہیں پوچھتے۔۔۔ اب تُو ہی بتا۔ میں کیا کروں۔''

صوبہ جاتا تو علی احمد آ جاتا۔ علی احمد کو دیکھ کر رحمت بی بی پھول کی طرح کھل جاتی۔ ''علی احمد بتا زمین کا کچھ بنا؟ کیا کہتا ہے شاہ جی۔ رحمت بی بی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ گاؤں میں اسکی ناک اونچی ہو۔ گاؤں والے اسے جانیں مانیں۔ گاؤں میں اسکا نام ہو۔ لوگ سینے تھام کر کہیں۔ ہئے یہ رحمت بی بی کے گھر فلم چل رہی ہے۔ ہئے یہ رحمت بی بی کی موٹر ہے۔ ہئے یہ رحمت بی بی کی حویلی بن رہی ہے۔ رحمت بی بی کو کھانے پینے سے دلچسپی نہ تھی۔ پر جب گاؤں والیاں سینے تھام کر کہتیں ہئے رحمت بی بی کے گھر تو کوک کے کریٹ آتے ہیں کریٹ۔ تو رحمت بی بی کی ایڑیاں زمین سے اٹھ جاتیں۔ اگرچہ بچوں کی کوک پینے کی عادت کے خلاف وہ بولتی رہتی تھی لیکن دل ہی دل میں وہ خوش ہوتی تھی کہ سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور ہے کہ رحمت بی بی کے گھر کریٹ آتے ہیں۔ اور کھوکھے والا ان کے لئے خاص طور پر مرغی کے پیکٹ لاتا ہے کافی کے ڈبے لاتا ہے۔ مکھن کے ٹین لاتا ہے اور جب گاؤں والیاں آ کر اسکے باورچی خانے میں کوٹنے چھاننے اور بلو ہنے والی مشین حیرت سے دیکھتیں اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رحمت بی بی پر نظر ڈالتیں تو فخر اور انبساط سے اس کے بند بند میں گویا چھوٹی چھوٹی بتیاں روشن ہو جاتیں۔ رحمت بی بی کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ گاؤں میں ایک مکان بنوائے ایسا مکان جیسے ذیلدار کی حویلی تھی۔ لیکن اسکی یہ خواہش ابھی پوری نہ ہو سکی تھی۔

سب سے پہلے تو اسمٰعیل کے چاچے غلام علی نے اس پر اعتراض کیا تھا وہ رحمت بی بی کو سمجھاتا رہا کہ دیکھ رحمتے گاؤں میں مکان بنوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مکان شہر میں بنوا۔ جسے تو کرایے پر چڑھا سکے دو تین ہزار روپے کی آمدن ہو جائے گی۔ جب اسمٰعیل واپس آئے گا تو اسے گزارے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے نہیں پڑیں گے۔

رحمت بی بی نے غلام علی کی بات کا کبھی جواب نہ دیا تھا بس سنتی اور مسکرا دیتی غلام علی کہتا دیکھ رحمتے پتر کی کمائی کو گنوا نہیں۔ کھا پی کر نہ اڑا۔ اسے کسی کاروبار میں لگا کہ جب تیرا پتر واپس آئے تو اسکا ایک چلا چلایا کاروبار ہو۔ آمدنی ہو۔ گزارہ ہو۔

رحمت بی بی غلام علی کی بات کیسے مان لیتی۔ اسے آمدنی نہیں چاہیے تھی۔ گزارے کا فکر نہ تھا۔ اسے تو گاؤں والوں پر اثر ڈالنا تھا۔ گاؤں والیوں کے منہ سے یہ سننا تھا۔ ہئے یہ ماڑی رحمت بی بی کی ہے۔ رحمت بی بی بھی سچی تھی۔ جسنے ساری عمر گاؤں کی کامی بن کر گزاری ہو۔ گھر گھر کا کام کیا ہو۔ جسے گاؤں والیوں نے ہمیشہ رحمتے بی رحمتے کہکر بلایا ہو۔ اسکے نزدیک سب سے بڑی عشرت یہی ہو سکتی تھی نا کہ گاؤں والیاں اسے رحمت بی بی کہہ کر بلائیں اسے اپنے برابر کی سمجھیں۔ یا شاید رحمت بی بی گاؤں والوں سے اس بیتی ہوئی خفت کا انتقام لے رہی تھی۔

ہاں۔ اس روز رحمت بی بی کے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس روز وہ بات نہ تھی جو عام طور پر ہوا کرتی تھی۔ اس روز رحمتے چپ چاپ صحن میں کھاٹ پر بیٹھی تھی اسکے ہاتھ میں ہتھ پنکھا تھا جسے وہ جھلانا بھول بیٹھی تھی۔ بیچاری سوچوں میں گم تھی۔ گھر کے دوسرے لوگ چپ چاپ اپنی اپنی کوٹھڑی میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے نوجوان پریشان تھے۔ جب سے اسمٰعیل کا خط آیا تھا کہ ڈاکٹر نے آنکھوں کی وجہ سے اسے ان فٹ کر دیا ہے۔ گھر کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

رحمت بی بی جملہ گھر والوں کی نسبت زیادہ غمگین تھی۔ ہاتھ میں ہتھ پنکھی اٹھائے وہ سارے گھر میں حواس گم قیاس گم یوں گھومتی پھرتی تھی جیسے وہ گھر نہیں کوئی ویرانہ ہو۔ کبھی برآمدے میں آ بیٹھتی کبھی صحن میں کبھی گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ صحن میں بیٹھے بیٹھے وہ زیر لب بڑبڑانے لگی۔ میں کب کہتی ہوں کہ نہ آئے۔ اسکا اپنا گھر ہے جم جم آئے۔ سو بسم اللہ پر ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ میری حسرتیں تو دل ہی میں رہ گئیں۔ کم از کم مکان ہی بن جاتا لوگ کہتے یہ اسمٰعیل کی حویلی ہے اب تو شاہ جی زمین بیچنے پر بھی راضی ہو گیا ہے۔ چلو دو چار کمرے ہی چھت لیتی۔ اتنا تو میرے پاس ہے۔ پر کیا فائدہ وہ چپ ہو گئی۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً جوش میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔ اے ڈاکٹر کو کچھ چڑھا دیتا۔ چلو ایک دو مہینے ہمیں کچھ نہ بھجتا پر فٹ تو ہو جاتا۔ بس دو چار سال اور لگا لے گھر بن جائے۔ لیکن اسے

ان باتوں کا کیا پتہ۔ وہ تو بہت ہی سیدھا ہے اتنا ہی نہیں جانتا کہ پیسہ چڑھا دو تو سب چلتا ہے سب رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اللہ اسے عقل دے کہ کچھ دے دلا کر بات بنائے۔ ایسا نہ ہو کہ مونڈی لٹکائے واپس گھر آ جائے۔''

جب اسمٰعیل، طفیلے کے ڈیرے پر پہنچا تو وہ بہت خوش تھا۔ طفیلے نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بولا۔ ''میں نے کہا نہ تھا کہ ڈاکٹر مان جائیگا۔ وہ تو بلکہ انتظار میں ہوگا کہ کب تو آئے اور نذرانہ پیش کرے۔''

''ہاں''، اسمٰعیل نے کہا ''ڈاکٹر نے فٹ لکھ دیا ہے۔''

''کیسے نہ لکھتا''، طفیل بولا۔

''پر صرف ایک سال کے لیے فٹ کیا ہے۔'' اسمٰعیل نے کہا، صرف ایک سال کیلئے۔''

''مطلب یہ کہ سال کے بعد پھر نذرانہ پیش کرو۔''

''پر طفیلے! اسمٰعیل نے کہا ''ڈاکٹر نے مجھے ایک مہینے کا رسٹ دے دیا ہے کہتا ہے مہینہ بھر کام کرنے کی مناعی ہے کہتا ہے چھٹی کرو۔''

''ٹھیک ہے، طفیل نے کہا ''تو گھر ہو آ۔ ایک مہینے کیلیے ہاں میں انہیں تار دے دیتا ہوں۔'' اسمٰعیل نے کہا۔

''اونہوں، طفیل بولا۔ ''کیا فائدہ۔ تار تیرے پہنچنے کے بعد ملے گا تو اطلاع دیے بغیر اچانک پہنچے گا تو گھر والوں کو اور ہی زیادہ خوشی ہوگی۔''

صبح سویرے ابھی ملا نے اذان نہیں دی تھی کہ رحمت بی بی کا دروازہ زور زور سے بجا۔ صوبہ چلا رہا تھا۔ بی بی دروازہ کھولو۔ دیکھو کون آیا ہے۔ شور شرابا سن کر رحمت بی بی بڑبڑا کر اٹھی۔ اپنا دوپٹہ اٹھایا اور دروازے کی طرف بھاگی۔

''کون آیا ہے صوبے کون آیا ہے؟''

''بی بی جی اسمٰعیل آیا ہے۔'' صوبہ خوشی سے چلایا۔ بڑھیا نے سینے پر ہاتھ مارا۔ بولی ہئے اسمٰعیل آ گیا اور پھر وہیں کھاٹ پر ڈھیر ہوگئی۔

صوبہ کی آوازیں سن کر زبیدہ دوڑی دوڑی باہر آئی دروازہ کھولا۔ چارپائی پر ماں کو ڈھیر پڑے دیکھ کر اسمعیل کا دل بیٹھ گیا۔ رحمت بی بی کا اوپر والا دھڑ چارپائی پر تھا نچلا لٹک رہا تھا۔ اسکا منہ کھلا تھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے تھے۔ اسمعیل نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا پھر اسکا سر گود میں رکھ کر بولا ''ماں میں آ گیا ہوں، ماں میری طرف دیکھ ماں۔''

رحمت بی بی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر ان میں حرکت نہ تھی روشنی نہ تھی۔ اس نے چیخ ماری۔ ''ماں''، سارے گاؤں میں رحمت بی بی کے انتقال کی خبر پھیل گئی۔ گاؤں والیاں کہہ رہی تھیں۔ ہئے کتنی محبت تھی اسے اپنے بیٹے سے، اسکے آنے پر اتنی خوشی ہوئی کہ شادی المرگ ہوگئی۔

پیٹی شاپ کیپر

دفعتۃً عاصم پر وہ لمحہ وارد ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ ارد گرد لاشیں پڑی ہیں۔ حنوط شدہ لاشیں۔ ڈھلکے ہوئے چہرے، سوجی ہوئی آنکھیں، لٹکے ہوئے ہونٹ۔ چاروں طرف موت کی رینگتی ہوئی جھریاں۔ بے حسی کی چمٹی ہوئی جونکیں اور سدا کی پھٹکار ہی پھٹکار۔

پھر دفعتاً اُسے خیال آیا۔۔۔ میں۔۔۔ میں بھی تو انہی میں سے ہوں! کیا میں بھی۔۔۔!

دور بادل کی گرج سُن کر شیخ بلاول چمڑے والے چونکے۔ اُن کے لٹکے ہوئے ہونٹوں میں لہر سی پیدا ہوئی۔ حقارت بھری لہر۔ ''آج پھر گرجنے لگا''۔ اُنہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر ناک چڑھائی۔

''روز ہی گرجتا ہے'' ارجمند لوہے والے چہرے کی شکنیں یوں ابھریں سمٹیں جیسے لوہے کی سلاخوں بھرا ٹرک اُلٹ گیا ہو۔

''چمڑے کے سٹاک پڑے پڑے گل رہے ہیں''۔ شیخ بلاول نے ہونٹوں کی تھوتھنی بنا کر موسم کا مذاق اڑایا۔

حاجی امان اللہ موسم نے بے نیاز چُپ چاپ بیٹھا دانتوں میں خلال کرنے میں مصروف تھا۔ چہرے پر گراں باری اور بے تعلقی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو سیری شکم پُری ہی پیدا کر سکتی ہے۔

خیر مرزا کے گالوں پر قرض کی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ مال کے نئے کنسائمنٹ کا حساب لگانے میں کھویا ہوا تھا۔

وہ چاروں عاصم کے دوست تھے، دوست تھے، لیکن وہ چاروں کسی کے ساتھی نہ تھے، کسی کے دوست نہ تھے، حتیٰ کہ ہر کوئی خود سے بھی بیگانہ ہو چکا تھا۔ افراد کا اژدہا سب رشتوں کو نگل چکا تھا۔ اُس روز عاصم نے اُنہیں لنچ پر مدعو کیا تھا اور کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دفعتاً عاصم پر وہ لمحہ وارد ہو گیا۔ گرد و پیش پر سلو مومنٹ طاری ہو گئی۔ چہرے سٹل کلوز اپس میں بدل گئے۔ چاروں ساتھی عاصم کی نگاہ میں ننگے ہو گئے۔

پتہ نہیں کیوں ایسا ہوتا ہے، لیکن ایسا ہوتا ہے کہ زندگی کے لمحات کی مالا میں دفعتاً ان جانے، بے وجہ ایک منور منکا آ جاتا ہے۔ اس لمحے میں چیزوں اور شخصیتوں سے مانوسیت کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور چونکا دینے والی حقیقتیں بھیانک شکل میں سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔

عاصم نے دیکھا کہ اُس کے گرد لاشیں پڑی تھیں۔ حنوط شدہ لاشیں۔

دفعتاً اُسے خیال آیا میں بھی تو انہی میں سے ہوں۔ کیا میں بھی ایک لاش ہوں اور وہ باتھ روم میں آئینے کی طرف بھاگا۔

پندرہ برس پہلے عاصم کارونٹ کیمیکلز فیکٹری کی مزدور کالونی میں احمد علی کی کریانے کی دوکان پر منشی کی حیثیت سے ملازم تھا۔ سٹاک منگوانا اور فروخت کا حساب کتاب رکھنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔

پہلے چھ ایک مہینے تو وہ بڑے اطمینان سے اپنے کام میں منہمک رہا۔ پھر جیسے جیسے اس پر کاروبار کے بھید کھلتے گئے ویسے ویسے ایک بے نام سی بے چینی پیدا ہوئی گئی۔

جب وہ دیکھتا کہ شیخ احمد علی زیادہ منافع کمانے کی ہوس میں ضروری اشیاء کا تھوڑا پیدا کر دیتا ہے اور کالونی کے مزدور ضروریات کے حصول کے لئے کس قدر مضطرب ہوتے ہیں، تو اُس کے دل میں غصہ اُبھرتا۔ جی چاہتا مزدوروں کے سامنے شیخ احمد علی کا بھانڈا پھوڑ دے، پھر با آواز بلند اُسے گالیاں دے اور سو اور قسم کی گالیاں اور حساب کتاب کی کتابیں

شیخ کے منہ پر مار کر دوکان سے باہر نکل جائے۔ اُسے مزدوروں سے دلی ہمدردی تھی۔

ایک طرف فیکٹری کے مالک انہیں بے وقوف بنانے میں مصروف تھے دوسری طرف فیکٹری کے اہلکاران پر رعب جمانے کی لذت میں مدہوش تھے۔ تیسری طرف ان کے اپنے لیڈر ذاتی مفاد کے لئے اُنہیں استعمال کر رہے تھے اور چوتھے، کالونی کے دوکاندار خود پیدا کردہ مہنگائی سے لوٹ رہے تھے۔

کئی مرتبہ اُسے خیال آتا کہ فیکٹری کے رابطہ افسر سے مل کر شیخ احمد علی کی ذخیرہ اندوزی کی شکایت کرے۔ اس نیت سے وہ دو ایک بار ناظم کے پاس گیا بھی، لیکن بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اس لئے لوٹ آیا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ناظم نے اُسے پکڑ لیا۔ کہنے لگا ''بولو کیا کہنا چاہتے ہو''؟

اس پر عاصم کے اوسان خطا ہو گئے۔ شکایت کرنے کی ہمت نہ پڑی، لیکن اتفاق سے ایک بات سوجھ گئی۔ بولا جناب! میں شیخ احمد علی کریانہ فروش کی دوکان پر منشی ہوں۔ اگر آپ کالونی میں مجھے ایک دوکان الاٹ کر دیں تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ مزدوروں کو بازار سے سستی چیزیں فراہم کروں گا''۔

ناظم ہنس کر بولا ''تم بازار سے چیزیں خریدو گے، کالونی میں لا کر بازار سے سستی کیسے بیچو گے؟''

''جناب یہ ہو سکتا ہے''۔ عاصم نے کہا۔

''تم اس کی گارنٹی دو گے''۔

''جناب مجھے تین مہینے کے لئے دوکان دے دیجیے، اس دوران اگر بھاؤ کے متعلق ایک بھی شکایت ہو تو الاٹ منٹ منسوخ کر دیجیے''۔

جناب یہ ہو سکتا ہے۔ عاصم نے جواب دیا۔ تم اس کی گارنٹی کیسے دو گے منیجر بولا۔

جناب میں دکان پر لکھ کر بورڈ لگا دوں گا کہ یہاں بازار سے سستی چیزیں بکتی ہیں۔ جب بھی کوئی خریدار آپ سے شکایت کرے تو بے شک آپ میری الاٹ منٹ منسوخ کر دیں۔

اُس روز منیجر اچھے موڈ میں تھا اس نے سوچا چلو آزما دیکھو، اس میں کیا ہرج ہے۔
چنانچہ یوں عاصم کو کالونی میں ایک دوکان مل گئی او ناظم نے اعلان کر دیا کہ اگر دوکان سے چیزیں بازار سے سستی نہ ملیں تو ہم سے شکایت کی جائے۔

عاصم نے کہنے کو تو بات کہہ دی، لیکن تفصیلات پر کبھی نہ سوچا تھا۔ اب دفعتاً اُس پر ایک ذمہ داری آ پڑی تو بیچارہ سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا کہ کون کون سی چیز اسٹور کے لئے منگوائے، کہاں سے منگوائے، جو بازار سے کم قیمت پر فروخت کر سکے۔

عاصم کے دوست ریاض نے اُس کی ہمت بندھائی،

بولا ''مرا کیوں جاتا ہے تُو! میں تیرا بازو بنوں گا۔ اللہ کا نام لے کر کام تو شروع کر! نیک نیتی سے کام کیا جائے، تو اللہ خود راستے پیدا کر دیتا ہے۔

پھر وہ دونوں کام پر جُت گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے گھی فیکٹری سے براہ راست بناسپتی گھی کے ڈبے منگوائے اور اُنہیں فیکٹری پرائس پر بیچ دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں ڈبے بک گئے۔ یہ ڈبے فیکٹری سے بڑے بڑے لکڑی کے بکسوں میں بند ہو کر آتے تھے۔ اُنہوں نے یہ بکس بیچ دیئے یہی اُن کا منافع تھا۔
پھر اُنہوں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص اسٹور سے گھی کا ڈبہ خریدے اُس پر لازم ہو گا کہ ڈبا خالی ہونے پر اسٹور میں واپس دے جائے۔ یوں اسٹور میں خالی ڈبے جمع ہونے شروع ہو گئے جو وہ فیکٹری کے ہاتھ بیچ دیتے۔

گھی کے ڈبوں کی سیل چل نکلی تو اُنہوں نے چائے کے ڈبے منگوانے شروع کر دیئے اور چند ہی دنوں میں گھی کے ڈبوں اور چائے کے پیکٹوں کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ گردونواح کی کالونیوں سے خریدار آنے لگے۔ اس پر گھی اور چائے کی فیکٹریوں نے اُنہیں خصوصی کمیشن دینا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ عاصم کے کہنے پر اُنہوں نے اسٹور پر بڑے بڑے بورڈ آویزاں کر دیئے اور ان بورڈوں کا ماہوار کرایہ دینے لگے، یوں باقاعدہ آمدنی کی صورت پیدا ہوئی اور ایکس فیکٹری پرائس پر فروخت کرنے کی رسم پکی ہو گئی۔

اسٹور چل نکلا۔ پھر بھی عاصم ہر وقت سوچتا رہتا کہ کونسی نئی چیز ہے جسے وہ کم قیمت پر بیچ سکتا ہے! کچھ دنوں بعد انہوں نے تمام مصالحہ جات خریدے اور اُنہیں ہتھ چکی میں پسوا کر اسٹور میں رکھ لیا۔ پھر دیہات سے مرغی اور انڈوں کا انتظام کیا۔ جنگل سے خالص شہد منگوا کر بوتلوں میں بھر لیا۔ یوں آہستہ آہستہ اُن کا اسٹور مختلف چیزوں سے بھرتا گیا اور صرف تین مہینے میں اُنہیں اتنی کامیابی ہوئی کہ ناظم نے دوکان کی الاٹمنٹ کو پکا کر دیا اور ساتھ ہی عاصم کو ایک رہائشی کوارٹر بھی دے دیا جہاں وہ اپنی بیوی عائشہ اور تینوں بچوں جاوید، نوید اور ارشی کو کالونی میں لے آیا۔

اُن دنوں عاصم اور ریاض بے حد خوش تھے، اس لئے نہیں کہ کاروبار چل نکلا، بلکہ اس لئے کہ وہ مزدوروں کو سستی چیزیں فراہم کر رہے تھے۔

مزدور کالونی کا یہ اسٹور اس قدر کامیاب ہوا کہ جلد ہی اُنہیں نیو کالونی میں ایک برانچ کھولنی پڑی۔ عاصم نے نیو کالونی کا اسٹور ریاض کی تحویل میں دے دیا۔

پھر ایک ناخوشگوار واقعہ عمل میں آیا۔ نیو کالونی کے اسٹور کے متعلق شکایات موصول ہونے لگیں۔ صارفین نے الزام لگایا کہ مرچوں کے پیکٹوں میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ اس پر ناظم نے باقاعدہ تحقیق کی۔ ملاوٹ ثابت ہو گئی اور عاصم نے مجبوراً ریاض کو برطرف کر کے اسٹور اپنے چارج میں لے لیا۔ یوں دونوں دوستوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔

بہر حال جلد ہی فیکٹری ایریا میں عاصم سٹورز کی تعداد دو سے چار ہو گئی اور عاصم چین سٹورز کی ساکھ بندھ گئی۔

اب عاصم چین سٹورز کی تعداد تیس تک پہنچ چکی تھی جن میں دو ڈھائی سو آدمی کام کر رہے تھے۔ عاصم کے دونوں بیٹے جوان ہو چکے تھے اور بی اے کرنے کے بعد اسٹورز کو جدید اصولوں کے مطابق چلا رہے تھے۔ بڑا بیٹا سجاد جنرل منیجر تھا۔ چھوٹا نوید سیلز مینجر۔
ہر روز عاصم کو ایک ڈیلی سمری سٹیٹمنٹ پیش کر دی جاتی جس میں روز کی سپلائی اور سیل کے گوشوارے درج ہوتے۔ عاصم اُن گوشواروں کا مطالعہ کرتا اور مناسب احکام جاری کر دیتا۔

اس کے علاوہ بھی کبھار وہ کسی اسٹور کا معائنہ کرنے چلا جاتا اور اپنی تخلیق کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتا۔

لیکن اُس روز اُس ظالم لمحے نے گویا اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنے روبرو ننگا ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ ایک بزنس مین ہے، ایک عام بزنس مین جس کا عوام سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے، جسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں، انسانیت سے کوئی واسطہ نہیں، جو صرف پیسہ کمانے کے لئے جیتا ہے، پیسہ، اور پیسہ، اور پیسہ!

اس سے پہلے عاصم نے ایک خوش فہمی پال رکھی تھی کہ وہ وہی پرانا عاصم ہے جس کا قصدِ حیات پیسہ کمانا نہیں، بلکہ عوام کو سستے داموں ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ہے۔ اُس لمحے اُس کی خوش فہمی پاش پاش ہوگئی۔

اُس رات جب وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ کمرے میں پلنگ پر ایک اور لاش پڑی ہے، ریشم میں لپٹی ہوئی گوشت کی گٹھڑی، آنکھیں پھولی ہوئی، گال لٹکے ہوئے، ٹھوڑی جیسے گوشت کی تھل تھل کرتی دلدل ہو۔

عاصم کی بیوی عائشہ عرصہ دراز سے اس گھر میں اپنی حیثیت کھو چکی تھی۔ باورچی خانے میں نوکروں کا راج تھا۔ گھر کا انتظام بچوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اگر کبھی عائشہ دخل دیتی تو جاوید، نوید اور ارشی تینوں ہنس کر ٹال دیتے، ''ممی آپ نہیں سمجھتیں''۔ یہ جملہ سن سن کر وہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ واقعی نہیں سمجھتی۔

اُس روز عاصم کو پہلی مرتبہ شدت سے محسوس ہوا کہ وہ دونوں حنوط شدہ لاشیں ہیں جو افراط کے کوڑے کے ڈھیر پر یوں پڑی ہیں جیسے پلاسٹک کے ٹوٹے ہوئے کھلونے جنہیں زمانے نے کھیل کر پھینک دیا ہو۔

اُس روز عاصم کے دل میں آرزو نے کروٹ لی کہ وہ پھر سے جی اُٹھے اور اُس رات جب ناظم نے ڈیلی سمری سٹیٹمنٹ پیش کی، تو عاصم نے دیکھا کہ اسٹورز میں لگژری گڈز کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، عوامی آئیٹم کم ہوتے جا رہے ہیں اور اسٹورز کا ماٹو بدل کر دی

ایلیٹ اسٹور رکھ دیا گیا ہے۔ یہ آخری تنکا تھا۔ عاصم تلملا اُٹھا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ غصے سے گرجا۔

''جناب اسٹور کی پالیسی بدل دی گئی ہے''۔ ناظم نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' وہ غرایا۔

''جاوید صاحب کا حکم ہے جناب۔''

پھر جاوید اس کے روبرو کھڑا اُسے سمجھا رہا تھا۔ ''ڈیڈی آپ کو بزنس کے جدید اصولوں کا پتہ نہیں۔ آج کے بزنس میں فیئر پرائس کا کوئی کنسپشن نہیں۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا کہ چیز کی کیا قیمت ہونی چاہیئے، بلکہ یہ کہ ہم چیز کو کس قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں۔ ڈیڈی قیمتِ خرید کو قیمت فروخت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر دو روپے کی چیز کو ہم دس روپے پر فروخت کر سکتے ہیں، تو کیوں نہ کریں! بہت سی چیزیں ایسی ہیں ڈیڈی جو صرف اس لئے بکتی ہیں کہ اُن کی قیمت زیادہ ہے۔ مہنگی چیز اسٹیٹس سمبل ہوتی ہے۔ ڈیڈی آج کی خریداری ضروریاتِ زندگی پر مبنی نہیں بلکہ سٹیٹس ریکوائرمنٹس پر مبنی ہے۔ اگر ہمارے اسٹورز کو ترقی کرنی ہے تو ہمیں یوٹیلٹی اسٹور نہیں بلکہ سٹیٹس اسٹور بنانا پڑے گا۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں''۔

عین اُس وقت ڈرائیور داخل ہوا اور بولا۔ ''بڑے صاحب ائیرپورٹ جانے کا ٹائم ہو گیا ہے''۔

معاً اُسے یاد آیا کہ اُسے تو عائشہ کے ساتھ کراچی جانا ہے جہاں ایک عزیز کی شادی ہے۔ ائیرپورٹ پر عاصم بکنگ سے فارغ ہو کر عائشہ کے پاس آیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ ائیر سروس وردی میں ملبوس ایک اجنبی سے باتیں کرنے میں مصروف ہے۔ اجنبی اُسے دیکھ کر آگے بڑھا اور لپٹ گیا۔ وہ اُس کا پرانا ساتھی ریاض تھا۔

لاؤنج میں وہ تینوں ایک طرف بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بیتے ہوئے زمانے کی باتیں اور وہ بیتی ہوئی باتوں کو از سرِ نو تازہ کرنے میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ جہاز اُڑ بھی گیا اور اُنہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ پھر ریاض کی ضد کہ وہ رات اُس کے گھر بسر کریں۔ ریاض کا

کوارٹر چھوٹا سا تھا، لیکن وہ زندگی کی جدوجہد اور جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے سوچا شاید جدوجہد ہی زندگی ہے جسے افراط چاٹ کر لاش میں بدل دیتی ہے۔

ریاض کے کوارٹر میں بسر کی ہوئی رات عاصم اور عائشہ دونوں کے لئے زندگی بخش بن گئی۔ عائشہ بھی امارت کی بے حسی کے خول سے باہر نکل آئی اور چہک چہک کر باتیں کرنے لگی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس میں سوجھ بوجھ پیدا ہو گئی ہے، وہ باتیں سمجھنے لگی ہے۔

اگلے روز جب وہ بیدار ہوئے تو سرہانے رکھے ہوئے اخبار کو دیکھ کر عائشہ چونکی، بولی دیکھیں تو اخبار میں آپ کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ عاصم نے اخبار اٹھالیا۔

شہ سرخی میں لکھا تھا ائیر سروس کا جہاز جل کر فنا ہو گیا۔ مسافروں اور عملے میں سے کوئی نہیں بچا۔ ذیلی سرخی میں لکھا تھا۔ اس جہاز میں عاصم چین اسٹورز کے مالک اور اُن کی بیگم بھی سوار تھے۔

عین اُس وقت ریاض داخل ہوا۔ ''تم نے خبر سنی؟''

عاصم نے ریاض کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ریاض بہت تلملایا۔ بولا ''جلدی چلو تمہارے بیٹے تمہارا سوگ منا رہے ہوں گے''۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ'' عاصم نے کہا۔ ''جو ہونا تھا ہو گیا''۔

لیکن، ریاض بولا ''وہ سمجھیں گے کہ عاصم مر گیا ہے''۔

''انہیں سمجھنے دو''! عاصم نے کہا، پھر وہ آہ بھر کر بولا ''ریاض، عاصم تو دیر کا مر چکا، صرف ایک ڈھانچہ باقی تھا، ایک لاش اُسے دفن ہو جانے دو۔۔۔ ورنہ مجھے کبھی دوبارہ زندگی نصیب نہ ہوگی''۔

ایک سال کے بعد جاوید اپنے دفتر میں بیٹھا سمری سٹیٹمنٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ چونک اُٹھا
''ناظم صاحب! ہمارے انڈسٹریل ایریا والے چاروں اسٹورز جام ہوئے جا رہے ہیں''۔

''ہاں'' ناظم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر یہی صورت رہی تو ہمیں ان کو بند کرنا پڑے گا''۔

''جناب انڈسٹریل ایریا میں ایک نیا اسٹور قائم ہوا ہے۔ فیئر پرائس اسٹور، وہ روز بروز بزنس سمیٹتا جا رہا ہے''۔

''کس کا اسٹور ہے وہ؟'' جاوید نے پوچھا۔

''پتہ نہیں جناب، کوئی ریاض اینڈ برادرز ہیں''۔

''اُسے خرید کیوں نہ لیں''۔ جاوید بولا۔

''وہ نہیں بیچیں گے جناب''۔

''کیوں؟''

''وہ پٹی شاپ کیپر ہیں، تاجر نہیں''۔

''چلو! ایک نظر اسٹور کو دیکھ لیں''۔

کچھ دیر کے بعد جاوید اور ناظم دونوں گاڑی سے اتر کر اسٹور میں داخل ہوئے۔ کاونٹر پر ایک بڈھا کھڑا پیکٹوں میں چائے کی پتی بھر رہا تھا۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گھی کے خالی ڈبوں کے چپ نکال رہا تھا۔

جاوید کو دیکھ کر بڈھے نے منہ موڑ لیا۔ جاوید پرائس لسٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔ دفعتاً اُس نے کہا ''تم ان قیمتوں پر چیزیں کیسے بیچتے ہو؟ تمہیں تو بزنس کے اصولوں کا بھی پتہ نہیں''!

''ہم بزنس نہیں کر رہے، ریاض بولا ''جناب ہم صرف سستی چیزیں بیچ رہے ہیں''۔

''یہ تو سراسر حماقت ہے''۔ جاوید نے کہا۔

''معاف کیجئے'' ریاض بولا ''آپ کے والد صاحب نے بھی تو انہی اصولوں پر کاروبار شروع کیا تھا''۔

جاوید چونکا، پھر بولا ''والد صاحب بزنس مین نہیں تھے، وہ تو پٹی شاپ کیپر تھے''۔

ایوان

میری مشکل یہ ہے کہ میں خود سے ہم آہنگ نہیں ہوں گویا بچے کا جیب ہوں۔ جس میں بھانت بھانت کی بے جوڑ چیزیں پڑی ہوتی ہیں۔ سپرنگ کی ایک ٹوٹی ہوئی کمانی رنگین چاک کا ٹکڑا دو موتی ہوائی جہاز کی تصویر، گڑ کی بھیلی اور نہ جانے کیا کیا۔ میری نفسیت مداری کا تھیلا ہے۔

میں آپکی ہمدردی کا مستحق ہوں کہ میں نے ایسے متضاد عناصر میں زندگی بسر کی ہے۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ گذشتہ سات سال سے بتدریج مر رہا ہوں۔ آہستہ اہستہ میرے اعضے اور حواس موت سے ہم کنار ہو رہے ہیں آج یہ حس مرگئی کل وہ عضو مفلوج ہو گیا۔ فرد یکمشت نہیں مرتا ان حالات میں آٹھویں سفر پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ اب سفر پر نہیں نکلوں گا۔

صاحبو۔ مجھے علم ہے کہ جب میں، میں کہتا ہوں تو اسکا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ میری میں، میں ۷۷ سال کا ایک بوڑھا اور ۱۷ سال کا ایک بچہ دونوں شامل ہیں ستر سال کا بوڑھا ۳۰۸ سال بیت چکا ہے چونکہ اسنے ہمیشہ زندگی کے دیئے کو چومکھیہ جلائے رکھا۔ ۱۷ سال کا بچہ ہر سال عمر میں گھٹتا رہا بچے نے بہت ضد کی کہ اٹھ چل ایک بار اور صرف ایک بار اونہوں میں نے اپنا ارادہ اور پختہ کر لیا، اور پختہ، لیکن دل ہی دل میں میں اپنے ارادوں سے ڈرتا ہوں زندگی بھر وہ لوہے کی طرح ابھرتے رہے اور خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے رہے۔ اسکے باوجود میں اپنے ارادے پر قائم رہا۔

ایک روز جب میں دھوپ میں بیٹھا بیتی ہوئی باتوں کو از سر نو جینے کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا کہ ایک نجومی آ نکلا۔ بولا

''جہازی اپنی قسمت کا حال جانے گا؟''

میں نے کہا ''نہیں بھائی، میں تو حال میں جینا چاہتا ہوں، ماضی اور مستقبل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''مستقبل نہیں'' وہ بولا۔ ''وہ بات جو عنقریب تیرے حال میں داخل ہونے والی ہے۔''

''اب میرے حال میں کیا داخل ہوگا بھائی؟'' میں نے جواب دیا اب گنجائش بھی رہی ہو۔''

''واقعات گنجائش دیکھتے نہیں'' اس نے کہا، ''پیدا کر لیتے ہیں۔''

پھر اُسنے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لیا دیکھنے لگا اور چلا کر بولا ''ارے جہازی تجھے تو ابھی آٹھویں سفر پر جانا ہے۔''

''ہاں جانا ہے میں نے کہا۔ آخری سفر پر، جہاں میں جاؤنگا نہیں لے جایا جاونگا۔''

''اونہوں'' وہ بولا ''لے جایا نہیں جائیگا، جائیگا۔''

''میں جہاز پر قدم نہیں رکھوں گا۔'' میں نے اسے گھورا۔ اس نے پانسہ پھینکا حساب کیا اور بولا ''بے شک تو جہاز پر قدم نہیں رکھے گا۔''

''گاڑی میں بھی نہیں بیٹھوں گا۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''بے شک''، وہ بولا ''نہ گاڑی نہ گھوڑا نہ ریل۔''

''تو پھر کیسے سفر پر جاؤں گا؟'' میں نے طنزیہ پوچھا۔

''مجھے پتہ نہیں۔'' وہ بولا۔ ''کچھ سفر کئے جاتے ہیں کچھ ہو جاتے ہیں۔ کچھ واقعات کو تم بیتتے ہو کچھ واقعات تمہیں بیتتے ہیں۔ اللہ کی باتوں کو کس نے جانا ہے۔ پانسے سے صاف ظاہر ہے کہ سفر لازم ہے۔'' اُسنے پھر پانسہ اٹھا کر پھینکا کاغذ پر لکیریں کھینچیں اور بولا۔ ''تجھے ایک نئی مخلوق سے ملنا ہے۔''

''کیا پھر سے مافوق الفطرت دیو ہیکلوں یا بونوں سے؟''

''نہیں''، وہ بولا۔ ''مافوق الفطرت نہیں۔''

''کوئی خوفناک مخلوق؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں''، وہ بولا۔ ''قابل ترس، جو خالص نہ ہوں مخلوط ہوں، جس طرح تُو خود ہے۔ بیک وقت بوڑھا اور بچہ۔ وہ قابلِ ترس ہوتے ہیں۔ خوف ناک نہیں۔''

''چل چل دفع ہو۔'' میں نے غصے میں اسے دھتکارا۔

''چلا جاتا ہوں''، وہ بولا۔ ''چلا جاتا ہوں۔ مگر میری بات یاد رکھ آٹھویں سفر سے تُو بچ نہیں سکے گا۔''

نجومی چلا گیا۔ لیکن میرے دل میں اک دھواں سا سلگا گیا چند ایک ہفتے تو میں دھواں دھواں رہا پھر میں نے اپنے دکھ کو پکا کر لیا اور آہستہ آہستہ نجومی کی بات کو بھول گیا۔

اس روز جب میں اکبر آباد سے روانہ ہوا تو مطلع بالکل صاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ شام پڑنے سے پہلے ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر کالی گھٹا چھا گئی۔ ہوا چلنے لگی یہ دیکھ کر میں نے قدم تیز کر دیا۔ پھر بوندا باندی ہونے لگی۔ بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ سامنے ایک پرشکوہ ایوان کھڑا ہے اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یا اللہ یہ ایوان کہاں سے آیا، ضرور میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اس بوچھاڑ سے بچنے کیلئے میں دوڑ کر ایوان میں جا داخل ہوا۔

انڈے سی سفید دیواروں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا تھا جس میں جگہ جگہ بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے سوچا کسی سے پوچھوں کہ یہ براق سی دیواروں کا سلسلہ کیا ہے۔ لیکن وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا آدمی کی تلاش میں میں آگے چل پڑا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے کے درمیان میں سات آٹھ آدمی ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے تسلی ہوگئی کہ ایوان میں انسان آباد ہیں۔ جنات نہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں اوٹ کے پیچھے میں ایک کرسی پر ستانے کیلئے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گول میز پر انسانوں کی بجائے بڑے بڑے فٹ

بال پڑے ہیں۔ میں تو حیران رہ گیا یا اللہ یہ کیا اسرار ہے یہاں تو انسان بیٹھے تھے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو انکے سروں میں نلکیاں لگی ہوئے تھیں۔ پیچھے ایک مشین چل رہی تھی جو ان میں ہوا بھر رہی تھی۔ سر فٹ بال کی طرح پھولتے جارہے تھے۔ دھڑ پچکتے جا رہے تھے۔ جیسے کارٹونوں میں ہوتا ہے۔ اتنا بڑا سر اور چھوٹا سا دھڑ۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ وردی میں ملبوس ایک ملازم داخل ہوا۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا بڑے ادب سے بولا۔ ''جناب بڑے صاحب نے آپکو سلام دیا ہے۔''

میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا ''میاں میں تو ایک پناہ گیر ہوں بارش سے بچنے کیلے اس ایوان میں آ گھسا ہوں۔''

''بڑے صاحب کو معلوم ہے آپ چل کر ان سے بات کرلیں۔''

بڑا صاحب ایک پتلا دبلا چھریرے جسم کا آدمی تھا۔ مجھے دیکھ کر اُسنے ہاتھ سے اشارہ کیا بیٹھے۔ میں نے کہا ''جناب کوئی غلط فہمی ہے۔''

''کوئی غلط فہمی نہیں۔'' وہ بولا۔

''جناب میں تو ایک راہ گیر ہوں جو طوفان سے پناہ لینے ایوان میں داخل ہوا۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' وہ بولا، ''غلط فہمی ہماری نہیں آپکی ہے۔''

''میری غلط فہمی؟''

''ہاں، یہ طوفان صرف اس لیے چلایا گیا تھا کہ آپ ایوان میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔'' حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''تو کیا میں خود نہیں آیا؟''

''نہیں''، وہ بولا، ''لائے گئے ہو۔''

''لیکن کس لئے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے ارکان کی ریلیف کیلے۔''

''ریلیف''؟

''ہاں'' وہ بولا، ''ریلیف اس کا مفہوم جلد ہی آپ پر واضح ہو جائیگا۔''

''لیکن آپکے ارکان کے سر تو پھول کر فٹ بال بن جاتے ہیں۔''

''ہاں'' وہ بولا'' ہم انکی سوچ بچار کی صلاحیتوں کو ڈویلپ کر رہے ہیں۔''

''لیکن سوچ بچار تو انسانیت کی غایت نہیں، وہ تو رکاوٹ ہے۔''

''بے شک'' وہ بولا، ''رکاوٹ ہے لیکن ہم انسان نہیں ایڈمنسٹریٹرز تخلیق کر رہے ہیں، کنڈیشن کر رہے ہیں۔''

''اگر دست و بازو مختنی ہو گئے تو۔''

''دست و بازو کو ڈویلپ کرنے کا بلاک اس کے عقب میں ہے۔'' اُسنے میری بات کاٹ کر کہا۔ یہ سن کر میں اٹھا۔

''معافی چاہتا ہوں، میں تو دل کا پرچارک ہوں نہ ذہن نہ دست و بازو کا۔''

''اسی لیے ہم نے آپکو چنا ہے۔'' وہ بولا۔

''نہیں نہیں'' میں چلایا۔ ''میں سوچ بچار کی بھول بھلیوں میں نہیں پڑوں گا، میں تو احساسات کا قائل ہوں جذبات کو غایت سمجھتا ہوں میں یہاں نہیں رکوں گا۔''

''آپ کی مرضی ہے لیکن بیکار ہے آپکو باہر کا راستہ نہیں ملے گا جب آپ تلاش سے تھک جائیں تو پھر سے میرے پاس آ جایئے گا۔''

منیر اور منیرہ

منیرہ نے آنکھیں کھول لیں وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ چیزوں کی ترتیب بالکل ویسی ہی تھی جیسے ہوا کرتی تھی۔ میز وہیں پڑی تھی اس پر کاغذات شیشیاں، سگریٹ کے پیکٹ اور ایش ٹرے بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ بک شلف اسی طرح کتابوں سے اٹا ہوا تھا۔ فرش پر یہاں وہاں کتابیں، جاسوسی ڈائجسٹ، اخبار اور پامسٹری کے پرانے رسالے پڑے تھے۔ وارڈ روب کا ایک پٹ نیم وا تھا۔ اندر کپڑے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ وہی بے ترتیبی وہی بے نیازی، وہی طبعی سوداٹ۔

ہاں اس کا کمرا جوں کا توں تھا۔ لیکن منیرہ کی نگاہوں میں وہ کمرا بیگانہ لگ رہا تھا۔ سطحوں میں وہ ہم آہنگی نہ تھی۔ چیزوں میں ملائمت نہ تھی۔ رنگوں میں جاذبیت نہ تھی۔ چیزیں اکھڑی اکھڑی اور بدرنگ نظر آ رہی تھیں یوں جیسے وارنش اتر گیا ہو اور سطحیں بدرنگ رہ گئی ہوں۔

اس کی نظر دیوار پر لگے ہوئے پوسٹر پر جا پڑی۔ یہ تصویر اس نے بڑے چاؤ سے خریدی تھی۔ اگرچہ سستی تھی لیکن منیرہ کے خیال میں اس میں تھرڈ ڈائمنشن تھی۔ موضوع میں بلا کی اپیل تھی۔ تصویر میں ایک تیکھی سلونی دوشیزہ کا بسٹ دکھایا گیا تھا۔ خدوخال ستواں تھے۔ چہرہ کیوٹ تھا۔ انداز میں نمائش نام کو نہ تھی۔ چہرے پر ملائمت اور ملاحت تھی۔ خود شعوری سے مبرّا لڑکی کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر گال پر آ ٹکا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے گال سے ڈھلک کر ابھی فرش پر گر جائے گا۔ تصویر کے رنگ لاؤڈ نہ تھے۔ سیاہی کی آمیزش کی وجہ سے وہ موضوع سے ہم آہنگ تھے۔ یہ تصویر منیرہ کو بہت اچھی لگتی تھی۔ اس میں جذبات تھے، گہرائی تھی، تاثر تھا، لیکن شدت نہ تھی۔ دکھ تھا لیکن غم خوری نہ تھی۔ ٹوٹ تھی لیکن ریزہ ریزہ قسم کی نہیں، ایسے لگتا تھا جیسے بلور میں بال آ گیا ہو۔

منیرہ پڑے پڑے اکثر اس تصویر کو دیکھا کرتی تھی۔ دیکھتی رہتی، حتیٰ کہ اسے محسوس ہوتا کہ وہ تصویر میں جذب ہو کر اس کا حصہ بن چکی ہو۔ جیسے وہ ستا ہوا چہرہ وہ ڈھلکا ہوا آنسو اس کی اپنی بیتی ہو۔ پڑے پڑے وہ تصویر کو بیتی رہتی۔ بیتتی رہتی۔۔۔ لیکن اس روز اس تصویر میں وہ بات نہ تھی وہ ایک عام سا پوسٹر نظر آ رہی تھی۔ لڑکی ایک فرد تھی۔ تھرڈ پرسن، گال پر ڈھلکا ہوا آنسو، ایک نقش تھا اس میں نمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ گال سے ڈھلک کر فرش پر گرنے کا اندیشہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ اس روز وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ بیت نہیں رہی تھی۔ دو ایک منٹ وہ تصویر کو دیکھتی رہی پھر گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں۔

دفعتاً چھت کے قریب دیوار پر حرکت سی ہوئی۔ سامنے ایک چھپکلی تاک میں بیٹھی تھی۔ گردن اٹھی ہوئی۔ دم دیوار سے چپکی ہوئی۔ اس چھپکلی کو وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس نے منیرہ کو زچ کر رکھا تھا۔ وقت بے وقت پتہ نہیں کہاں سے باہر نکلتی اور دیوار پر سامنے آ بیٹھتی۔ اسے دیکھ کر کراہت سے اس کا رواں رواں لرزتا تھا۔ بدن کے بال کھڑے ہو جاتے۔ عجیب سی لہریں یوں چلنے لگتیں جیسے سرخ چونٹیوں کی قطاریں چل رہی ہوں۔ حلق سوکھ جاتا۔ طبعیت مالش کرنے لگتی۔ ایک بے نام سا خوف ابھرتا سمٹتا۔ پھر وہ پلنگ کے نیچے سے جوتا اٹھاتی اسے زور سے میز پر دے مارتی تاکہ دھماکہ ہو جسے سن کر چھپکلی ڈر کر بھاگ جائے۔ اس میں کبھی اس قدر جرات نہ ہوئی تھی کہ جوتا سیدھا چھپکلی کو دے مارے۔ اس کے دل میں چھپکلی کے لئے اس قدر حقارت تھی کہ اسے مارنا بھی گوارا نہ تھا۔ اس کی صرف ایک خواہش تھی کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ نظروں کے سامنے نہ رہے۔۔۔ لیکن اس روز وہ چھپکلی کو دیکھے جا رہی تھی۔ صرف آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ نہ جسم میں لہریں اٹھ رہی تھیں، نہ بال کھڑے ہوئے تھے، نہ حلق خشک، حتیٰ کہ پلنگ تلے سے جوتا اٹھانے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ نہ یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ نظروں سے دور ہو جائے۔ بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

چراؤں، ٹھک دروازہ کھلا۔ سامنے سانبھا کھڑی تھی۔ سانبھا پڑوسیوں کی سیامی

بلی تھی۔ جب بھی سانبھا منیرہ کے کمرے میں آتی تو منیرہ اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ''سانبھا'' وہ اسے بلاتی۔ سانبھا وہیں سے اچھلتی اور پلنگ پر منیرہ کے پہلو میں آ گرتی۔ پھر سرک کر اس کے جسم کے قریب تر ہو جاتی اور لیٹ لگا لیتی۔ منیرہ ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیاں اس کی گھنی اور ملائم ''جت'' میں کھبو دیتی۔ پھر اس پر ہاتھ پھیرنی لگتی۔ منیرہ کو سانبھا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عجیب سی لذت محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے جسم کی ساری قوت لمس سمٹ کر انگلیوں میں آ گئی ہو۔ انگلیاں لذت سے یوں شرابور ہو جاتیں جیسے گلاب جامن شیرے سے لت پت ہوتا ہے۔ پھر وہ دیر تک سانبھا کے پہلو میں پڑے پڑے اس کے بالوں کو سہلاتی رہتی۔۔۔

لیکن اس روز سانبھا کی میاؤں سن کر وہ جوں کی توں لیٹی رہی۔ سانبھا نے حسب معمول چھلانگ لگائی اور اس کے پہلو میں دبک کر لیٹ گئی۔ منیرہ نے اپنا ہاتھ اس کے بالوں پر رکھ دیا لیکن اس روز وہ بال اس قدر مخملی نہ تھے جیسے کہ پہلے ہوا کرتے تھے۔ اس کی انگلیوں میں لمس کی وہ جنت نہ تھی جو ہوا کرتی تھی۔ گلاب جامن تو تھا لیکن سوکھا سوکھا۔ شیرے کی وہ فراوانی نہ تھی۔

دفعتاً اسے یاد آیا۔۔۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ مائی گاڈ منہ سے چیخ سی نکلی۔ اسے یاد آیا کہ اب وہ منیرہ نہ تھی۔۔۔ وہ تو منیرہ سے منیر بن چکی تھی۔ اسے بیتی باتیں یاد آنے لگیں۔

ہاں میں بیمار پڑ گئی تھی۔ عجیب سی بیماری تھی۔ اعضا سکڑ رہے تھے۔ جسم میں لہریں چل رہی تھیں۔ پھرکیاں گھوم رہی تھیں۔ گھمنگھیریاں پڑ رہی تھیں۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے جسم کے اندر زلزلہ جھول رہا ہو۔ اعضا الٹ پلٹ ہو رہے ہوں۔ جیسے کایا پلٹ رہی ہو۔

دو دن تو میں دیکھتی رہی کہ یہ کیا ہو رہا ہے پھر گھبرا گئی۔ خوف زدہ ہو گئی۔ اپنی سہیلی ڈاکٹر خالدہ کے گھر پہنچی۔ خالدہ پہلے تو میری باتیں سن کر ہنستی رہی۔ پھر اعضا کی صورت حال دیکھی تو گھبرا گئی گاڑی میں بٹھا کر سیدھی مجھے جرمن ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ دو دن جرمن ڈاکٹر ٹسٹ لیتا رہا۔ تیسرے دن اس نے فیصلہ سنا دیا۔

ڈاکٹر خالدہ تمہاری سہیلی کے جسم میں سیکس ڈسٹربینسز ہو رہی ہیں۔ آپریشن ہو

گا۔

کیسا آپریشن۔ خالدہ نے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور بولا۔ تمہاری سہیلی کی جنس بدل رہی ہے۔

واٹ، میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

آپریشن فوری ہونا چاہیے، آج ہی ورنہ''۔۔۔

منیرہ کی زندگی میں صرف ایک آرزو تھی کہ کاش وہ لڑکا ہوتی اس کی زندگی کی تمام ترتلخیاں صرف اس وجہ سے تھیں کہ وہ لڑکی تھی۔ وہ ازلی طور پر ٹیڑھی لکیر سے تھی۔ اسے رسم اور پابندیوں سے چڑ تھی۔ مصلحت کو کسی صورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ رسم و قیود سے بے زار رکھ رکھاؤ سے بے گانہ، دروغ مصلحت آمیز سے یکسر منکر، کیمپس میں لڑکے اسے دیکھ کر شاک ہو جاتے تھے۔

میں بھی منیرہ کے ساتھ کیمپس میں تھا۔ ادھر کیمپس میں منیرہ کو سب نیرا کہتے تھے۔ یہ اس کا نک نیم تھا۔ میں نے نیرا کو چار ایک بار دیکھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا تو فیوز اڑ گیا۔ وہ لڑکوں کے دلوں میں دوری ایکشن پیدا کرتی تھی۔ حیرت اور کشش۔

اسے قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ کیمپس میں وہ بے تکلف گھومتی پھرتی۔ لڑکوں کے جھرمٹ میں ان جھک جا داخل ہوتی۔ نہ شرماتی نہ لجاتی نہ جھجکتی۔ بات ہو رہی ہوتی تو اس میں لقمہ دینے لگتی۔ بحث ہو رہی ہوتی تو اپنی رائے کا بے باکانہ اظہار کرنے سے نہ چوکتی۔ مذاق چل رہا ہوتا تو قہقہے لگاتی۔

سارے کیمپس میں منیرہ واحد لڑکی تھی جو خود کو پیش کرنے کے فن سے بے نیاز، نہ نخرہ۔ نہ جانے میں نہ انجانے میں ایسے پوز بناتی جو جاذب نظر ہوں۔ نہ لڑکوں کو خود کی طرف، متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔ اس نے کبھی بننے ٹھننے والا لباس نہ پہنا تھا۔ میک اپ نہ کیا تھا۔ نہ نیل پالش نہ آئی بلیک، نہ کاجل نہ سرخی۔ لپ اسٹک ضرور لگاتی تھی وہ بھی سکن کلر جو دکھتا نہ تھا، ہونٹوں کا اچھا لگتا نہ تھا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ منیرہ لائیو تھی۔ جیتی تھی، بھرپور جیتی تھی۔ بند بند زندگی سے لدا پھندا ہوا تھا۔ جو بھرپور جیتی ہیں انہیں گردوپیش کا احساس نہیں رہتا۔ کبھی خیال نہیں آتا کہ میں کیسی لگتی ہوں۔ یوں کروں تو اچھی لگوں گی یا بری۔ انہیں جینے سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ ''اچھی لگتی'' کے بارے میں سوچیں۔

منیرہ کے خدوخال ستواں تھے۔ قد چھوٹا، جسم بھاری، اعضاء میں کہیں بھی نازک پن نہ تھا۔ آنکھیں دیکھنے والی تھیں۔ دکھنے والی نہیں۔ سکون اور سنجیدگی میں چہرا اس قدر بھاری ہو جاتا کہ بھدا لگتا۔ بالکل مردہ لیکن اس کے پاس ایک ظالم مسکراہٹ تھی۔ تلوار جیسی، اور اسے اس تلوار کی کاٹ کا علم تھا۔

جب وہ مسکراتی تو یوں لگتا جیسے اللہ میاں نے ''کن'' کہہ دیا ہو۔ اندھیرا چھٹ جاتا صبح صادق کا اجالا پھوٹ کر نکلتا۔ چھا جاتا۔ رنگ پچکاری چل جاتی۔ لق و دق صحرا چمن بن جاتا۔ اس کے دانتوں کی چمک گردوپیش کو منور کر دیتی۔ آنکھوں سے نشیلی پھوار اڑتی۔ جو گردوپیش کھڑے لڑکوں کو بھگو کر رکھ دیتی اور اگر کوئی اس پھوار کی زد میں آجاتا تو یوں شرابور ہو جاتا جیسے موسلا دھار بارش میں کچی دیوار گل کر ڈھیر ہو جائے۔

پہلی مرتبہ میں نے اسے جمنیزیم میں دیکھا تھا۔ ٹہلتا ٹہلتا ادھر جا نکلا۔ لڑکے ایکسرسائز کر رہے تھے۔ ایک طرف تین لڑکے شاٹ پٹ کی مشق کر رہے تھے۔ وہاں منیرہ کھڑی ضد کر رہی تھی کہ میں بھی گولہ پھینکوں گی۔ اس نے قمیض کے بازو اوپر کر رکھے تھے۔ شلوار کے پائنچے ٹانگے ہوئے تھے۔ میں نے حیرت سے نیرا کی طرف دیکھا۔ یا اللہ یہ کیا شے ہے۔

دوسری بار میں نے اسے کیمپس کے برآمدے میں دیکھا۔ ایک جانب چار ایک لڑکے کھڑے تھے۔ ساتھ ایک سر بھی تھے۔ دوسری جانب چار ایک لڑکیاں چپ چاپ جھجکی ہوئی تصویر بنی کھڑی تھیں۔ غالباً بحث چل رہی تھی۔ موضوع تھا مرد اور عورت۔ دفعتاً منیرا بولی۔ میں مانتی ہوں کہ یہ مردوں کی دنیا ہے لیکن اس کی سبقت صرف طاقت کے بل بوتے

پر ہے۔'' پاور اور کرپٹس، ڈی جزیٹس'' جناب والا یاد رکھئے کہ یہ پوسپائی کے آخری دن ہیں۔اس کی دھونس سن کر مجمع پر خاموشی چھا گئی۔

تیسری مرتبہ میں نے اسے لڑکیوں کے ہاسٹل کے قریب دیکھا۔چند ایک لڑکے کھڑے نیرا پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ایک نے کہا یار وہ بڑی دلیر ہے۔دوسرا بولا۔ہمیں تو یار اس کی سمجھ نہیں آئی نہ سر نہ پاؤں، پتہ نہیں کیا شے ہے۔تیسرے نے کہا ہٹاؤ یار وہ تو آج کل حسن کے ساتھ پھرتی ہے۔حسن میں انٹرسٹڈ ہے۔عین اس وقت پیچھے سے منیرا برآمد ہوئی بولی۔''ہاں میں حسن میں انٹرسٹڈ ہوں، اینی آبجیکشن؟'' اس نے لڑکوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔''یس اینی آبجیکشن''۔سب پر پانی پھر گیا۔منیرا چند ایک ساعت کے لئے وہاں سب کے روبرو کھڑی رہی پھر خراماں خراماں آگے چل پڑی۔

آخری بار میں نے اسے کھوکھوں کے سامنے دیکھا۔یہ کھوکھے کیمپس کی سڑک کے کنارے پر بنے ہوئے تھے۔جہاں لڑکوں کو ہر وقت کھانا اور چائے تیار ملتے تھے۔کھوکھوں کے سامنے کافی بڑا میدان تھا جہاں لوہے کی کرسیاں اور میزیں پڑی ہوئی تھیں جب پر بیٹھ کر لڑکے کھانا کھایا کرتے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔بہت سے لڑکے ٹولیوں میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ان کے عین درمیان میں مگر سب سے الگ تھلگ منیرا ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔سامنے چاولوں کی ایک پلیٹ تھی جس پر بوٹیوں اور دہی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔وہ اس انہماک سے چاول کھا رہی تھی جیسے میدان میں تنہا بیٹھی ہو اور یوں منہ میں نوالے پہ نوالہ ڈالے جا رہی تھی جیسے دو دن کی بھوکی ہو۔

حیرت سے میں اس کی طرف دیکھنے میں محو ہو گیا۔لڑکیاں اول تو بھیڑ میں کھاتی نہیں۔کھائیں بھی تو دکھانے والا کھانا کھاتی ہیں، کھانے والا نہیں۔میں اسے دیکھنے میں اس قدر محو ہوا کہ کرسی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔دفعتاً وہ مڑی مجھے دیکھا۔مسکرائی، رنگ پچکاری کی ایک بوچھاڑ نکلی۔میں اس کی نگاہوں کی زد میں آ گیا۔اور کچی دیوار کی طرح گل کر ڈھیر

ہو گیا۔

میں منیرا کو جانتی ہوں۔کئی ایک سال ہم اکٹھی رہی ہیں۔میرا نام مغیرہ ہے۔منیرہ اور مغیرہ کی جوڑی سارے کالج میں مشہور تھی۔ہم دونوں کالج میں پڑھایا کرتی تھیں نا۔وہ بڑی لائق تھی، بڑی انٹیلی جنٹ، کیوٹ، ہمیشہ فسٹ ڈویژنر رہی۔ایم اے انگلش میں سیکنڈ ڈویژن آئی تو پورا ہفتہ غصے سے کھولتی رہی، سو نہ سکی۔

اس کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک وائلڈ لڑکی تھی۔اس وائلڈنس میں نمائش نہ تھی۔شورا شوری نہ تھی۔ایڈونچر کا جنون تھا۔معصومیت اور ایڈونچر کا شوق دراصل برتن چھوٹا تھا جان زیادہ تھی۔جو ہر وقت چھلکتی رہتی۔آدھی رات کو اٹھ بیٹھتی، چلو غیرہ ائیر پورٹ پر جا کر کافی پئیں۔

کوک پی رہی ہوتی اور کوئی گول گپے والا گزرتا تو اسے روک لیتی۔او غیرہ گول گپے میں کوک بھر کر کھائیں۔

سڑک پر چلتے چلتے کسی بندر والے مداری کو دیکھتی تو رک جاتی۔کہتی، بندر والے تماشہ دکھاؤ، نہیں نہیں مفت نہیں ہم پیسے دیں گے۔

ایک دفعہ ہم کہیں جا رہے تھے۔راستے میں مزدوروں کی جھگیاں تھیں۔وہاں عورتیں بیٹھی گا رہی تھیں۔دوڑ کر ان میں جا بیٹھی اور ان کے ساتھ گانے لگی۔حالانکہ بڑی بے سری تھی مگر اسے پرواہ ہی نہ تھی۔عورتوں کے درمیان یوں ان جھک گا رہی تھی جیسے تان سین کی بچی ہو۔اس کا کزن سکوٹر پر ملنے آیا کرتا تھا جب بھی وہ جانے لگتا تو ضد کرتی میں کک مار کر سکوٹر سٹارٹ کروں گی۔

ہاں تو لیٹے لیٹے دفعتاً اُسے یاد آیا کہ اب وہ منیرہ نہ تھی۔بلکہ منیرہ سے منیر بن چکی تھی۔اس کی زندگی بھر کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔اسے اس کا یا پلٹ کا یقین نہیں آ رہا تھا۔وہ خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی جو منیر بننے پر اسے محسوس ہونی چاہئے تھی۔۔۔الٹا ایک عجیب سی گھبراہٹ ایک بے نام خوف۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ منیرا چونکی۔ اس کی ماں اندر جھانک رہی تھی۔ جاگ رہی ہے۔ منیرے۔ وہ مدھم آواز میں بولی۔ منیرہ کا جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کئے پڑی رہے۔ وہ رابطوں سے خوف زدہ تھی۔

ماں اندر داخل ہوگئی۔ پیچھے پیچھے اس کا باپ تھا۔ دونوں اس کے پلنگ کے پاس آ کر کھڑے ہوئے۔ اس نے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ سامنے دو ٹھگنے کھڑے تھے۔ سہمے ہوئے ڈرے ہوئے۔ میں ان سے ڈرا کرتی تھی۔ کیا ان سے میں نے انہیں اتنی اہمیت دے رکھی تھی۔ کیا انہیں زندگی بھر میں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے جتن کرتی رہی۔۔۔ ٹھگنے بالکل ہی بالشتیے بن گئے۔

نہیں نہیں میں نے خود کو جھنجھوڑا۔ یہ میرے ماں باپ ہیں۔ اس کے دل میں ہلکا سا جذبہ پیدا ہوا۔ لیکن اس میں رنگ نہ تھا، رس نہ تھا۔ ایسے لگا جیسے مخمل کی بُر اڑ گئی ہو اور نیچے کھدر نکل آیا ہو۔

ماں باپ سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ابتداء میں اس کے دل میں ماں باپ کے لئے محبت ہی محبت تھی۔ پھر مسلسل لعن طعن پر اس میں غم وغصہ اور بالاخر خوف شامل ہوگیا۔ اس کے باوجود محبت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ غصہ اور خوف اسے معدوم نہ کر سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ ابا اسے پاس بلائیں، بٹھائیں۔ اس سے بات کریں۔ اسے بھی کچھ کہنے کا موقعہ دیں۔ لیکن ابا نے منیرہ کو کبھی کچھ کہنے کا موقعہ نہ دیا تھا۔ وہ لوگوں کی بات سنتے اور پھر منیرہ کی بات سنے بغیر فیصلہ سنا دیتے۔ انہیں ہر کسی کی بات پر اعتماد تھا صرف منیرہ ناقابلِ اعتماد تھی۔

جب وہ مدرسے میں تعلیم پا رہی تھی تو ایک بار باپ کے اس رویے پر اسے اتنا صدمہ ہوا تھا اتنا شاک کہ اسے بات کرنا بھول گیا تھا۔ حلق میں آواز نہ رہی تھی۔ چلنا بھول گئی تھی۔ ٹھوکریں کھانے لگی تھی۔ ہاتھوں میں سکت نہ رہی تھی پکڑ کمزور ہوگئی تھی۔ چیزیں گرنے لگی تھی۔

اس روز پلنگ پر لیٹے ہوئے بچپن کی اس حماقت پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔ ایسی احمق تھی میں کہ اتنی سی بات پر خود کو ہمیشہ کے لئے مضروب کرلیا۔ اتنی سی بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ان کی سوچ کی سطح اور ہے میری اور ہے۔ بے شک یہ میرے والدین ہیں لیکن آئی ڈونٹ بلانگ ٹو دم، میں اس گھر کو بلانگ نہیں کرتی۔ میں اور مٹی سے بنی ہوں یہ لوگ اور مٹی سے بنے ہیں۔ یہ میری سوچ کو نہیں اپنا سکتے۔ بیچارے منیرہ نے پہلی بار ماں باپ کے لئے ترس محسوس کیا۔

صرف ماں باپ ہی نہیں سارے رشتے کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ جذبات تو تھے لیکن ان میں وہ لگن نہ تھی۔ کنسرن نہ تھی۔ ویسے بھی جذبات بہت پتلے پڑ چکے تھے ان میں وہ گھمبیرتا نہ رہی تھی۔ وہ گہرائی نہ تھی۔ وہ رس نہ رہا تھا۔

جب منیر نے پہلی مرتبہ پتلون پہنی تو اس کا خیال تھا کہ دل میں وہی مستی وہی لذت پیدا ہوگی جو جب پیدا ہوا کرتی تھی جب وہ منیرہ تھی۔ اس زمانے میں وہ چوری چوری پتلون پہنا کرتی تھی تاکہ گھر والے نہ دیکھ لیں۔ یہ لذت حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک پتلون اور فلیٹ لنڈے سے خرید رکھے تھے۔ پتلون پہنتی تو ایسے لگتا جیسے کوے نے مور کے پر لگا لئے ہوں۔ خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ چال بدل جاتی۔ اک نشہ سا چھا جاتا تھا۔۔۔ لیکن اس روز جب منیر نے پتلون پہنی تو کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ دل میں لہریں اٹھیں نہ چال بدلی، نہ مور کے پر لگے۔ صرف پتلون کی بات نہیں عام وقت بھی لباس پہنے رنگوں کی وہ حس نہ رہی تھی۔ میچنگ میں وہ دلچسپی نہ رہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ لباس پہنتے وقت احساس ہی نہ ہوتا کہ وہ لباس پہن رہا ہے۔ ایسے لگتا جیسے پہن نہ رہا ہو بلکہ خود پر چڑھا رہا ہو۔ ٹانگ رہا ہو۔

منیر بننے کے بعد دو ہفتے تو ایک بے نام سی جھجھک قائم رہی۔ پرانی سہیلیوں سے ملنے میں جھجھک محسوس ہوئی۔ سہیلیاں بھی کنفیوزڈ ہو جاتیں۔ ملنے کے لئے آگے بڑھتیں گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتیں۔

پہلے اس کے نزدیک ہر سہیلی ایک فرد ہوا کرتی تھی۔لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی۔ اس کی نگاہ میں کسی لڑکی میں بھی انفرادیت نہ رہی تھی۔لڑکیوں کا رویہ ہی بدل گیا تھا۔سہیلی والا رخ مستور ہو گیا تھا۔صرف وہ رخ باقی رہ گیا تھا جو عورت مرد کے روبرو پیش کرتی ہے۔ چاند رخ، لبھانے کا رخ۔توجہ طلبی کا رخ۔تمام کی تمام لڑکیاں گڑیاں بن چکی تھیں۔کل دار گڑیاں جو پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔آؤ مجھ سے کھیلو مجھے چاہو، تسخیر کرو۔

منیر کے دل میں عورت کی عزت کم ہوتی جا رہی تھی۔آرزو ابھرتی جا رہی تھی۔ آرزو میں جذبات کی رنگینی کم ہوتی جا رہی تھی۔خواہش کی شدت ابھر رہی تھی۔گیت کے بول ابھرتے جا رہے تھے۔پس منظر میں ساز کے تاروں کی مدہم لرزشیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔جاگتے کے رنگین خواب معدوم ہو رہے تھے۔حقائق ابھر کر چھائے جا رہے تھے۔

حسن کو دیکھ کر منیر حیران رہ گیا تھا۔پہلے جب وہ حسن کو دیکھا کرتی تھی تو اندر کے تاروں میں ایک لرزش پیدا ہوتی۔مدہم دلنواز لرزش۔حسن کے بڑے بڑے ہاتھوں اور لمبی لمبی بانہوں کو دیکھ کر وہ محسوس کرتی جیسے وہ اس کے گرد لپٹے جا رہے ہوں۔چاروں طرف لہرا رہے ہوں۔ان لمبی لمبی بانہوں نے اسے گھیرے میں لے لیا ہو۔پھر وہ پگھلنے لگتی پگھلتی جاتی پھر حسن کی آنکھوں سے انگارے پھوٹتے۔اس کے اندر ان جانے فلیتے کو آگ لگ جاتی اور وہ دھکتا۔دھکے چلا جاتا۔اسے ایسے لگتا جیسے ابھی وہ دھک مرکز تک پہنچ جائے گی پھر اک دھماکا ہوگا اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر جائے گی۔

لیکن اُس روز اس نے منیر کی نگاہ سے حسن کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔حسن لمبی بانہوں والا ایک کلمڑی لڑکا تھا اور بس۔اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ اپنی لمبی بانہوں کو کیسے سنبھالے۔وہ اس کے راستے میں بری طرح حائل تھیں۔اس کی آنکھوں کے شرارے خالی خالی تھے۔ان میں آگ نہ تھی تپش نہ تھی۔فلیتے کو آگ لگانے کی طاقت نہ تھی۔

منیر خود سے مایوس ہوتا جا رہا تھا۔منیر بننے کے بعد اسے آزادی تو حاصل ہو چکی تھی لیکن اندر کی چھلک ختم ہوتی جا رہی تھی۔جذبات سوکھتے جا رہے تھے۔ان میں نہ رنگ

رہا تھا نہ رس نہ ہی ان کا تار بندھتا تھا۔

گھبرا کر منیر نے اپنی توجہ صندلی کی طرف منعطف کر لی۔صندلی اس کی پرانی شاگرد تھی۔وہ بلا کی حسین تھی۔آنکھوں سے نشیلی نگاہیں نکلتیں۔ہونٹوں کو سمیٹ کر بٹوا بناتی تو وہ توجہ کا مرکز بن جاتے۔منہ چوم لینے کو جی چاہتا۔جھینپتی تو سرخ رنگ کی ایک لہر چہرے پر چل جاتی، چلے جاتی۔اس کا جسم بڑا موزوں تھا۔خدوخال جاذب نظر تھے۔جلد سنہری تھی۔ بال بھورے کالے تھے۔

اس روز منیر نے بڑی چالاکی سے صندلی کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔گھر والے کسی تقریب پر گئے ہوئے تھے۔منیر اور صندلی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔منیر صندلی سے باتیں کیے جا رہا تھا۔وہ تصویر بنی بیٹھی تھی۔دفعتاً منیر نے محسوس کیا کہ اس کی باتیں محض فرار تھیں جو بات وہ اس سے کہنی چاہتا تھا کچھ اور تھیں۔اس بات کو ذہن سے کوئی تعلق نہ تھا۔وہ بات اس کے جسم میں پھلجڑی کی طرح انگارے اڑا رہی تھی۔وہ بات اس کی توجہ کو کسی اور سمت جانے نہ دے رہی تھی۔

اس وقت دو جسم روبرو بیٹھے تھے۔صندلی کا مرمریں جسم اور منیر کا آتشیں۔ذہن ماؤف ہو چکے تھے۔منیر چاہتا تھا کہ صندلی سے باتیں کرے۔کمیونیکشن کا رشتہ جوڑے لیکن جسم اسے بے بس کیے جا رہا تھا۔جسم میں ایک ہوائی چل جانے پر مچلی ہوئی تھی۔ایک ایٹم دھماکہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔محبت کے جذبات سمٹ کر معدوم ہوئے جا رہے تھے۔جسم کا جن بوتل سے نکل رہا تھا۔صندلی کے جانے کے بعد اس رات اکیلے میں لیٹے ہوئے منیر سوچ رہا تھا۔سامنے منیرہ کھڑی ہنس رہی تھی۔

تم وہ بولی ”تم زندگی سے محروم ہو چکے ہو۔تم میں جذبات کی لہریں خشک ہو چکی ہیں اور جس میں جذبات کی لہریں نہ ہوں وہ کیا جانے کہ خوشی کیا چیز ہے غم کیا شے ہے۔ لذت کا کیا مفہوم ہے، زندگی کا کیا مطلب ہے۔

تم سارنگی تھے جذبات کے تاروں کی لرزشوں سے معمور۔اب تم تاروں سے

محروم ہو۔ زندگی کی روانگی سے محروم پانی کی لہریں ریت کی لہریں بن چکی ہیں۔ رس گلا تو ہے پر شیرا نہیں۔ رس گلا کاٹھ بن گیا۔ تم سارنگی سے ہارمونیم بن چکے ہو۔ صرف آواز باقی رہ گئی ہے بھونڈی آواز جس میں سُر نہیں لرزش نہیں۔ منیر دیوانہ وار اٹھ بیٹھا۔

آدھی رات کے وقت جرمن ڈاکٹر کا دروازہ بج رہا تھا۔ ڈاکٹر، ڈاکٹر مجھے پھر سے منیرہ بنا دو۔ ڈاکٹر پلیز، ڈاکٹر بے شک اٹ از اے مینز ورلڈ، لیکن زندگی عورت کی ہے صرف عورت جیتی ہے اس میں روانی ہے رس ہے، رنگ ہے اور مرد کاٹھ، صرف کاٹھ، خواہش سے سوکھا ہوا کاٹھ۔ ڈاکٹر پلیز ڈاکٹر۔ جرمن ڈاکٹر کا دروازہ بجے جا رہا تھا۔

بوند بوند بیتی

اس روز صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ کئی بار کھل جاتی ہے۔ لیکن میں پھر سے بند کر کے پڑ رہتا ہوں۔ پھر آنکھ لگ جاتی ہے۔ اس روز کھلی تو غیر از معمول کھلی ہی رہی۔ بند کرنے کی بہت کوشش کی نہ ہوئی۔ مجبوراً اٹھ کر بیٹھ گیا، بتی جلائی۔

دفعتاً میری نگاہ نینی پر پڑی۔ ٹھٹھکا۔ بیٹھا حیران دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ نینی کی دونوں آنکھوں میں بوندیاں لٹک رہی تھیں۔

نینی شیشے کا ایک پیپر ویٹ ہے۔ جو پچیس سال سے میرے پاس ہے۔ شیشے کے اس گولے کی ایک طرف دو آنکھیں بنی ہوئی ہیں۔ آنکھوں کی تصویر نہیں، آنکھیں۔ ابھری ہوئی آنکھیں۔ مژگاں کی پنکھیاں نکلی ہوئی۔ تین سمتی آنکھیں۔ دکھنے والی نہیں دیکھنے والی آنکھیں۔ اندر کھبُ جانے والی نظریں۔

اس سے پہلے بارہا اسی بات پر بیوی سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔ بھڑک کر نہیں۔ دبا دبا جھگڑا۔ بیوی نے کئی بار مجھ سے شکایت کی تھی۔ کہنے لگی شیشے کے اس گولے سے پانی کیوں رستا رہتا ہے۔ جس کاغذ پر رکھو گیلا ہو جاتا ہے۔

گولے میں بھلا پانی کیسے آیا۔ اندر ہو بھی تو رسے گا کیسے۔

وہ بولی۔ تم نہیں سمجھتے۔ اس گولے میں کہیں نا کہیں ضرور پانی ہے۔ اور وہ آنکھوں سے رستا ہے۔ ٹپکتا ہے۔ بوند بوند۔

میری بیوی سمجھتی ہے میں بالکل نہیں سمجھتا۔ اَن سمجھ ہوں۔ اس لئے وہ اکثر کہا کرتی ہے، تو نہیں سمجھتا۔

ہم دونوں میں رواداری کا بندھن ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتی۔ میری بات سن کر وہ در پردہ ہنس دیتی ہے۔ ہٹاؤ یہ نہیں سمجھے گا۔ اس کی بات سن کر میں دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ اسے کون سمجھائے۔ لہذا ہم جھگڑا نہیں کرتے۔ بحث نہیں کرتے۔ درگزر کرتے ہیں۔ بڑے اتفاق اور محبت سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔

میری بیوی نے دو چار مرتبہ مجھ سے یہی بات دہرائی تھی ایک مرتبہ تو وہ کاغذ بھی دکھایا تھا جس پر نینی پڑا تھا۔ کاغذ گیلا تھا۔

کاغذ کو دیکھ کر میں کیا کہتا بھلا۔ بیوی کو سمجھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جان چھڑانے کے لئے میں نے جواب دیا تھا۔ ہاں ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ کاغذ بے شک گیلا ہے۔ شاید واقعی نینی سے پانی رستا ہے۔

دو ایک برس کے بعد وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی تھی۔ میری بانہہ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی مجھے کمرے میں لے گئی تھی۔ لو خود دیکھ لو۔ نینی کی آنکھوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں۔

میں نے دیکھا واقعی نینی پرنم تھا۔

پہلے تو میں ٹھٹھکا۔ ذہن لڑکھڑایا۔۔۔ پھر سنبھل گیا۔ تاویلیں سوچنے لگا۔ جیسے ان ہونے حقائق کو دیکھ کر دانشور کیا کرتے ہیں۔

بھائی صاحب میں ایک پڑھا لکھا دانشور ہوں۔ چاہے اپنی آنکھوں سے دیکھوں، اپنے کانوں سے سنوں، مگر میں مانوں گا نہیں۔ جب تک بات میری عقل میں نہ آئے اسے کیسے مان لوں۔ مشاہدے پر مجھے بھروسہ نہیں۔ حواس بے اعتبارے ہیں۔۔۔ صرف عقل۔

میں نے سوچ دوڑائی۔ تاویلوں کے تنکوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ممکن ہے بیوی نے ان جانے میں نینی کو گیلے ہاتھ لگائے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود کو سچا ثابت کرنے کے

لئے ڈراپر سے دو بوندیں نینی کی آنکھوں میں لٹکا دی ہوں۔

میری بیوی نینی کی طرف اشارہ کر کے فاتحانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔۔۔ اب بولو۔

میں نے بن مانے ہینڈز اپ کر دیے۔

صاحبو اگر مجھ سے پڑھے لکھے دانشور شیشے کی آنکھوں کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر اسے مان لیں تو علم و دانش کے ہاتھ کیا رہ جائے گا۔

خیر۔۔۔ یہ تو پرانی تفصیلات تھیں۔

اس روز منہ اندھیرے میں نے اپنی آنکھوں سے نینی کو روتے ہوئے دیکھا تو میں سخت گھبرا گیا۔ پسینہ آ گیا۔ Optical illusion کا سہارا لینے کی سوچ رہا تھا کہ ٹپ کی آواز آئی۔ بوند گر کر ٹیبل کلاتھ پر پھیل گئی۔ ہاتھ لگایا۔ کپڑا گیلا تھا۔ نینی کی دوسری آنکھ میں بوند ابھی لٹکی ہوئی تھی۔ مجھ میں جرات نہ پڑی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے محسوس کروں۔ اگر واقعی بوند ہوئی تو میں کیا کروں گا۔

نینی ایک تحفہ تھا جو مجھے بھیجا گیا تھا۔ پتہ نہیں کس نے بھیجا تھا۔

پچیس سال پہلے۔ ڈاک سے میرے نام ایک پارسل آیا تھا۔ میں نے اسے کھولا نینی برآمد ہوا۔ ساتھ ایک پرچی بندھی تھی۔ لکھا تھا۔ ''ایک امانت تحفہ، نینی'' اور بس۔ میں نے بہت کوشش کی کہ پتہ لگاؤں کہ بھیجنے والا کون تھا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

پھر دفعتاً مجھے یاد آیا۔۔۔ ارے وہ دو آنکھیں۔ اندھیرے میں روشن آنکھیں۔ دیکھنے والی آنکھیں۔ نینی موصول کرنے سے پندرہ بیس روز پہلے ایک شام میں تفریحی پارک میں بیٹھا تھا، تھکا ہارا، کھویا کھویا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں زندگی کا میلا دیکھ کر واپس گھر آ چکا تھا۔

گھسان کا رن بیت چکا تھا۔ تخت پر بیٹھ چکا تھا، مورچھل کروا چکا تھا اور بالآخر معزول ہو چکا تھا۔ انتہائی تذلیل سے گزر چکا تھا۔ اور اب چلے ہوئے کارتوس کی طرح مٹی میں رُلا ہوا تھا۔ تھکا ہارا، کھویا کھویا، یہاں تک کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے کہ آرزو سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

اچانک ایک بوڑھی خاتون میرے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ آپ ممتاز مفتی ہیں؟

جی۔۔۔ میں چونکا، جاگا، سنبھلا۔

بولی۔۔۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔

کون بلا رہے ہیں؟

کہنے میں اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو فوارے کے پاس تشریف لائیں۔

ظاہر تھا کہ وہ عورت نوکرانی ہے۔ گھرانہ روایتی متمدن۔

فوارے کے پاس پودے کی اوٹ میں ایک خاتون بیٹھی تھی۔ یوں ایسا کہ آدھی ظاہر آدھی مستور۔ میں نے ظاہر کو غور سے دیکھا۔۔۔ آدھی خاتون آدھی لڑکی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب لڑکی کا دور نہیں آیا تھا۔ ابھی خاتون براجمان تھی۔ بیٹھنے کے انداز میں وقار تھا، ٹھہراؤ تھا۔ چٹ کپڑی پر اگرچہ رنگ کی دھاریاں نہیں تھیں۔ بازو خاتونی تھے۔ حسن قیام سے لدے پھندے۔ ہاتھ لڑکیانہ۔ انگلیاں بے چین مضمحل خمیدہ۔ اوپر سے سفید اندر سے حنائی۔ جسم خاتونی، پاؤں لڑکیانہ۔ چلتے چلتے سنبھلتے، پھر چلتے۔ چہرہ خاتونی کتابی آنکھیں لڑکیانہ متکلم شوخ چنچل۔ گفتگو ٹھیٹھ خاتونی۔ فرزانہ۔

مجھے دیکھ کر جھکی۔ آداب عرض ہے۔

چغتائی رنگ، نوابی انگ۔

معاف کیجئے ہم نے آپ کو تکلیف دی۔ وہ رکی، ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔

اس روز میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہم خاتون کو دیکھا تھا۔ ہم صاحب تو بہت دیکھے تھے۔ انا کے چھینٹے اڑاتے تھے۔ ہم تہذیب کے خلاف بغض سا پیدا ہو گیا تھا۔

اس روز ہم خاتون کا ہم انا کے چھینٹے نہیں اڑا رہا تھا۔ وقار کا بے نیاز حسن تھا، پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ میں نے ہم تہذیب کو صدقِ دل سے معاف کر دیا۔

چند ایک ساعت کے لئے وہ رکی پھر بولی۔

ہم آپ کو جانتے ہیں۔ دیر سے جانتے ہیں۔ آپ کو پڑھتے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔

میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ۔۔۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

قطعی نہیں۔ وہ بولی۔ رسمی بات نہ کیجئے گا۔ آپ کی تحریروں کو اچھا جاننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ رسمی نہیں لکھتے۔

میں بوکھلا گیا۔ کہنے کو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ خاموش تھی صرف آنکھیں روشن تھیں اور وہ قریب آ رہی تھیں اور قریب اور قریب۔

میں ان کالے کالے گہرے کنوؤں سے ڈر گیا۔

آپ کا نام؟ میں نے خاموشی کو توڑا۔

کوئی سا بھی رکھ لیجئے۔ وہ بولی، رکی، اچھا سا رکھیئے گا۔

آپ کہاں رہتی ہیں؟

کہیں بھی نہیں۔

پھر بھی، میں نے ضد کی۔

بے کار ہے، وہ بولی۔ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔

لیکن کیوں؟

ہر بات کا کیوں نہیں ہوتا۔

وجہ؟ میں اڑ گیا۔

ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے۔

بدل نہیں سکتا کیا۔

بدل سکتا ہے۔لیکن ہمیں بدلنا گوارہ نہیں۔

اس نے بات پر مہر لگادی۔

پھر سے خاموشی چھا گئی۔ پھر وہی آنکھیں ابھریں۔ ابھرتی گئیں، ابھرتی گئیں، چھا گئیں۔

ہاں وہ آنکھیں، دو آنکھیں۔ میں نے نینی کی آنکھوں کو از سرنو دیکھا۔ بڑی مشابہت تھی۔

جب اس نے کہا تھا۔کوئی سا نام رکھ لیجئے، اچھا سا رکھیئے گا۔تو مجھے خیال آیا تھا ''مرگِ نینی''۔اونہوں مرگ کی آنکھ تو دکھنے والی ہوتی ہے۔دیکھنے والی نہیں۔

شاید یہ تحفہ اسی نے بھیجا ہو۔لیکن امانت تحفہ سے کیا مطلب۔ بیک وقت امانت بھی تحفہ بھی۔سوچتا رہا سوچتا رہا۔مٹکی میں پانی ڈال کر بلوتا رہا مکھن نہ نکلا۔

بوندوں کی میری زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ میں ایک جذباتی آدمی ہوں۔

لیکن جذبہ مجھ میں فوارے کی طرح ایک دم نہیں پھوٹتا۔

پہلے بوند بوند گرتا ہے۔دل میں گرتا محسوس ہوتا ہے بوند بوند۔ پھر بھر جاتا ہے۔

سمندر میں مدوجزر اٹھتا ہے۔طوفان چلتے ہیں۔

میرے دل کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔

بڑے سے بڑا غم دھچکا نہیں لگاتا۔ بوند بوند گرتا ہے، بھر جاتا ہوں۔ پھر طوفانی چھینٹے اڑتے ہیں پھٹتے ہیں۔ بڑی سے بڑی خوشی شادی الرگ نہیں کرتی۔ بوند بوند جمع ہوتی ہے پھر وجدان کی بھا بھڑی چل جاتی ہے۔عشق دھارے میں نہیں آتا۔ بوند بوند اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ پھر انجانے میں کسی بوتل سے جن نکل آتا ہے۔ چھا جاتا ہے۔ پھر نہ ناؤ رہی ہے نہ قسمت رہی ہے۔

میری نعیت ازل سے بوند بوند ہے۔

میں اُسے جانتا تھا۔مگر انجانے میں جانتا تھا۔ پاگ بابا نے شعور دے دیا۔

پاگ بابا کے پاس مجھے اماں لے کر گئی تھی۔

اماں مجھ سے بڑی دکھی تھی وہ صراط المستقیم تھی۔ میں سانپ چال تھا۔ وہ چاہتی تھی میری چال میں بل نہ رہے۔اس لئے وہ پاگ بابا کے پاس گئی تھی۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا بابا جی دعا کریں، اس کے لئے دعا کریں۔

بابا نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔ اس کے لئے دعا کروں۔ اس کے لئے کیا دعا کروں۔ یہ تو بوندوں والا ہے۔ لے جا اسے۔ اندر بھی بوندیں باہر بھی بوندیں جا لے جا اسے۔

پتہ نہیں بوندوں والے سے بابا کا کیا مطلب تھا۔

میں سمجھا کہ میں لاعلاج ہوں۔ اماں سمجھی کہ برکت والا ہوں۔ گھر جا کر اماں نے فخر سے سب کو بتایا کہ میں بوندوں والا ہوں۔

محلے والوں نے تحسین بھری نظروں سے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔

ایک دن پتہ نہیں کس بات پر جب میرے دل میں غم بوند بوند ٹپک رہا تھا تو مجھے

بابا کی بات یاد آئی۔ بابا نے کیسے جان لیا کہ میں ازلی بوند بوند ہوں۔ لیکن باہر کی بوندوں سے اُس کا کیا مطلب تھا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔

نینی کی آمد سے کچھ دیر بعد ایک نئی بات عمل میں آئی۔ دل میں نئی سی بوندیں گرنے لگیں۔ جنہیں نہ غم سے تعلق تھا نہ خوشی سے نہ عشق سے۔ جیسے سوکھے کاٹھ پودے کو نمی مل رہی ہو۔ بے جان باسی چیز میں تازگی سرایت کر رہی ہو۔ ریت کے تودے میں سے کونپلیں پھوٹ رہی ہو۔

یہ کیسی بوند ہے جو تھکے ہارے اکتاہٹ کے ڈھیر میں دبے ہوئے میں زندگی کی رمق جگا رہی ہے۔

سوچ سوچ کر ہار گیا، کچھ پتہ نہ چلا، بھید نہ کھلا۔ کاٹھ میں بوندیں گرتی رہیں۔

بوند بوند گرتی رہیں، ٹپ ٹپ ٹپ۔

پاگ بابا مسکراتا رہا۔ تم تو بوندوں والے ہو۔

کٹڑہ گھنیاں کی طوائف گنگناتی رہی۔

بڑی بڑی بوندن

برسیں نیتوا، بڑی بڑی بوندن

***

دس ستمبر ۱۹۸۳ء

دروازہ بجا۔

باہر چٹھی رساں کھڑا تھا۔ مجھے ایک لفافہ تھما دیا۔ خط انجانا تھا۔ بے دلی سے کھولا۔

نیچے کوئی نام نہ تھا۔ اوپر پتہ نہ تھا۔ میں چونکا۔ یہ کیا چیز ہے۔ لکھا تھا:

وقت آگیا ہے کہ بات کہہ دی جائے۔

اب ہماری امانت نینی لوٹا دی جائے۔ پوسٹ بکس ۶۴۲۱، کراچی۔

ہم اور تم۔

اگر خدا دونوں میں ایک ہی کو پیدا کرتا تو شاید دنیا میں دکھوں کی ایک بوند کم ہوتی۔

کیسے بتائیں اس ایک بوند کے سمندر کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ اس میں کتنے رنگ گھلے ہیں۔ یہ دکھ کا پانی کتنا میٹھا ہے۔

تم ہرگز سمجھ نہیں سکے۔

ہمیں کامل یقین ہے تم اس سمندر کی گہرائی میں جھانک ہی نہیں سکتے۔

شاید تم ایک طمانچے کی شکل میں جواب دو۔ ''تو جھوٹی ہے''

ہم پھر بھی یقین نہیں کریں گے۔

اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے۔

تم پورے پورے سمندروں میں بیسوں بار ڈوب کر صحیح سلامت نکل چکے ہو۔ تم لوگوں کے لئے ڈوبنا، نکلنا، کپڑوں سے چھینٹے جھاڑ کر آگے بڑھ جانا۔ روزمرہ کا کھیل ہے۔

اس کی کیفیت کو کیسے سمجھ سکتے ہو۔ اور وہ اسے سمندر جیسی وسعت اور گہرائی دے دے۔

انجانے میں ڈوب جائے۔۔۔ اور چاہنے کے باوجود نکلنا نہ چاہے اس ڈر سے کہ اگر یہ پانی خشک ہوگیا تو دوسرے پانیوں کی تلاش اب ناممکن ہے۔

یہ دکھ ہمارا سرمایہ ہے۔

لیکن کبھی کبھی بہت پریشان ہوجاتے ہیں۔

جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے۔

تھپیڑے لگتے ہیں۔

لہریں ساحل پر پٹخیاں دیتی ہیں۔

کھینچ کر پھر سمندر میں لے جاتی ہیں۔

پتھروں پر پھینک دیتی ہیں۔

بڑی چوٹ لگتی ہے۔

***

بوندوں کا سارا بھید کھل گیا۔۔۔یا

شاید۔۔۔اور بھی گہرا ہو گیا۔

کنڈ

پگڈنڈی گھومتی ہوئی اس خشک ویران ٹیلے پر چڑھ رہی تھی۔ ہر چند قدم کے بعد میں تھک کر ستانے کے لئے رک جاتا لیکن میرے ساتھی قاضی صاحب پتھر پھلانگتے ہوئے اُچھلتے کودتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جوں جوں منزل قریب آتی جاتی تھی ان کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پیرو مرشد روشن شاہ سے ملنے کے لئے بے قرار تھے اور راستے میں مسلسل سرکار قبلہ کا تذکرہ کیئے جا رہے تھے۔

کسی بزرگ سے ملنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ قاضی صاحب نے اصرار کیا تھا کہ میں ان کے سرکار قبلہ سے ملوں۔ مجھے سکون کی تلاش تھی اور قاضی صاحب کا کہنا تھا کہ سکون کے متلاشی اوگی پہاڑی پر حضرت روشن شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

تھک کر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر قاضی صاحب رک گئے۔ تھک گئے۔ علی بھائی وہ بولے:

ہاں۔ پتہ نہیں آپ کیوں نہیں تھکتے۔

وہ مسکرائے۔ بولے شوق کی شدت راستے کی دشواریوں ختم کر دیتی ہے۔ مجھے سرکار قبلہ سے محبت ہے۔ میں انہیں دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔

سرکار قبلہ سے محبت، ایک سفید ریش بوڑھے سے محبت۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔

معاً سامنے پتھر کی اوٹ سے بوڑھے پروفیسر نے سر نکالا۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ ''صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو''۔ اس کے چہرے پر وہی پراسرار مسکراہٹ

تھی۔

وہی جملہ۔۔۔وہی جھریوں بھرا جانا پہچانا۔۔۔اک زمانے سے میں محسوس کر رہا ہوں گویا میں ایک آسیب زدہ مکان ہوں اور ''صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو''۔ اور وہ پراسرار مسکراہٹ۔۔۔آسیب میں گذشتہ اٹھارہ سال سے میری زندگی کے ہر اہم دوراہے پر کہیں نہ کہیں سے بوڑھے پروفیسر کا چہرہ ابھرتا ہے اور اس کی پراسرار آواز گونجتی ہے۔ ''صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو''۔ اور یہ جملہ میرے گردوپیش کو نیا مفہوم بخش دیتا ہے۔ ایک ایسا مفہوم جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ ایک ایسا مفہوم جسے میں انگ انگ میں محسوس کرتا ہوں۔

ایک عام سے چہرہ جسے میں نے آج سے اٹھارہ سال پہلے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اور ایک عام سا جملہ۔ میری ساری زندگی پر مسلط و محیط ہو جائے کتنی عجیب بات ہے۔

مجھے وہ رات اب بھی یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ رات کو ہم ملتان سے میل میں سوار ہوئے تھے۔ میں اور میرا ہمراز دوست راز۔ ڈبے میں صرف ایک شخص اوپر کے برتھ پر سو رہا تھا۔ اس کا منہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ باقی ڈبہ خالی تھا جلد ہی ہم اس سوئے ہوئے شخص کے وجود سے بے نیاز ہو گئے۔ اور مرجینا کی بات چل نکلی۔ ان دنوں میں مرجینا کی محبت میں سرشار تھا۔

مرجینا ایم اے میں میری ہم جماعت تھی۔ وہ خوب صورت نہ تھی۔ لیکن اس میں ایک پراسرار جاذبیت تھی۔ ہم روز ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ لیکن کبھی بات نہ کی تھی۔

ایک روز میں کالج کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مرجینا آ رہی ہے۔ اس وقت قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ میں نے سوچا کچھ کروں، محض

شرارت، اور تو کوئی بات نہ سوجھی۔ جب مرجینا قریب آئی تو میں نے سنجیدہ اور دکھی صورت بنا کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ جیسے بھکاری ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ وہ رک گئی۔ متانت سے اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ ایک اکنی نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دی اور یوں آگے نکل گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے وہ انارکلی میں گھومتے پھرتے بھکاری کو اکنی دے کر آگے نکل گئی ہو۔

اس کے بعد یہ میرا معمول بن گیا۔ جب بھی وہ اکیلی ملتی میں ہاتھ پھیلا دیتا وہ اکنی رکھ کر آگے نکل جاتی۔ اس چھوٹے سے واقعے نے میری دل میں اک طوفان سا پیدا کر دیا۔ بے مقصد طوفان۔

پھر مجھے یہ لگن لگ گئی کہ وہ مجھے اکیلے میں ملے۔ میں ایسے موقعے تلاش کرنے لگا۔

ایک روز کوئی موقعہ نہ ملا۔ میں ہم جماعتوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا مرجینا ہماری طرف آ رہی ہے۔ پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ بے اختیار میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ مرجینا صرف ایک ساعت کے لئے ٹھٹکی۔ پھر آگے بڑھی، بڑے اطمینان اور اہتمام سے ہینڈ بیگ کھولا اور اکنی میرے ہاتھ پر رکھ کر بڑے وقار سے آگے نکل گئی۔ میرے ہم جماعت پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان کے شور نے ایک طوفان بپا کر دیا۔۔۔اس روز دبے دبے طوفان میں شدت پیدا ہو گئی۔۔۔اور مبہم سا مقصد بھی۔۔۔ پراسرار جاذبیت تو مرجینا میں پہلے ہی تھی۔ اس پروقار جرات نے اس کے خدوخال کو ایک سنہرے دھندلکے میں لپیٹ دیا۔ اس کے سر کے گرد سیمیں ہالہ بنا دیا۔۔۔طوفان میں محبت کی مدوجزر شامل ہو گئی۔

پھر۔۔۔جلد ہی وہ دن آ گیا۔ جب طوفان جنون کی شکل اختیار کر گیا۔ محبت عشق

میں بدل گئی۔ مبہم مقصد نے وضاحت اختیار کر لی۔ اور وہ اس قدر پھیل گیا، اس قدر مسلط و محیط ہو گیا کہ ساری کائنات اس میں ڈوب گئی۔

اس روز نہ جانے میں کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ کالج کے پارک کے ایک کونے میں درخت کی اوٹ میں اکیلا کھڑا تھا۔ آہٹ سن کر میں نے سر اٹھایا۔ میرے روبرو مرجینا کھڑی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں ہاتھ پھیلاتا۔ مرجینا نے بازو بڑھایا اور ہتھیلی میرے قریب تر کر دی۔ اس وقت اس کی نگاہیں مجھ پر نہیں بلکہ گلاب کے ایک پودے پر مرکوز تھیں۔

اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ ایک سنہرا دھندلکا چھا گیا۔ انجانے میں میں نے اپنا ہاتھ کوٹ کے کالر میں ڈال لیا۔ اور جیسے بائیں پہلو سے دھڑکتا ہوا دل اکھاڑ کر مرجینا کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہو۔ مرجینا نے بھی ایک نگاہ اپنے بیگ پر ڈالی۔ اطمینان سے بیگ کو پتھر کی سیٹ پر رکھ دیا اور وہ ہاتھ جس پر میں نے اپنا دل رکھا تھا اپنی قمیض میں ڈال لیا۔ پھر کچھ کہے بغیر چلی گئی۔

مرجینا سے عشق کی یہ ابتدا تھی۔ اندازہ لگا لیجئے کہ انتہا کا عالم کیا ہو گا۔

ہاں مجھے وہ رات سیکنڈ کلاس کا وہ ڈبہ، ملتان سے لاہور تک کا سفر۔ اب بھی یاد ہے۔ ایک ایک تفصیل یوں محفوظ ہے جیسے میرے ذہن میں ریکارڈ ہو گئی ہو۔

مرجینا نے مجھے لاہور بلایا تھا۔ اس کے خط سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے والدین ہماری شادی پر رضامند نہ تھے۔ ان کے انکار نے مرجینا کے جذبہ محبت پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ اس کی جرات کو للکارا تھا۔ خط میں دکھ یا غصے کا عنصر نہ تھا۔ محفوظ قسم کی بے نیازی تھی۔ راز اور میں نے بار بار وہ خط پڑھا۔ راز کے دل میں ڈر اور خدشات جنم لے رہے تھے۔ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا میں راز کو تسلیاں دے رہا تھا۔ اس کے خدشات کا مذاق اڑا رہا تھا۔ کتنی الٹی بات تھی۔ عاشق اپنے رازدار کو تسلیاں دے رہا تھا۔۔۔ پھر نہ

جانے راز کی کس بات پر مجھے جوش آ گیا۔

ہم دونوں بالغ ہیں۔ میں نے چلا کر کہا۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان حائل ہونے کا کسی کو حق نہیں۔ ''صاحبزادے''، اوپر والی برتھ سے آواز آئی ''کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو؟''

ہم نے چونک کر اوپر دیکھا۔ چادر میں لپٹا ہوا ایک جھریدار چہرہ ہماری طرف گھور رہا تھا۔ چہرے کی سلوٹوں میں دکھ رینگ رہا تھا، تمسخر اور طنز سے پاک، خالص دکھ، مسکراہٹ پراسرار تھی۔

جو عشق کے طوفان کے تھپیڑوں میں ڈوب چکا ہو۔ اس سے محبت کے ابتدائی مفہوم کا مطلب سمجھنے کی بات کرنا۔۔ اس بڈھے کو کیا پتہ والہانہ عشق کسے کہتے ہیں۔ بیچارہ۔

میرا ابھرتا ہوا غصہ ترس میں بدل گیا۔

''کون ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی بھی سہی''۔ وہ بولا۔

''کیا آپ محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہیں''۔ میں نے بڈھے سے سوال کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حسرت بھری آہ نے اس کی مسکراہٹ کو اور بھی پراسرار بنا دیا۔ ''میری عمر اڑسٹھ سال ہے''۔ وہ بولا لیکن آج تک میں محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا''۔

''آپ بھی نہیں سمجھتے، تو پھر ہم دونوں میں فرق کیا ہے''۔ میں ہنسا۔

''بہت فرق ہے صاحبزادے، بہت فرق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھتا۔ لیکن صاحبزادے تم نہیں جانتے۔'' وہ رک گیا کچھ دیر تک چادر کو گھورتا رہا

پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا۔۔۔ہاں۔۔۔اس نے ایک لمبی آہ بھری۔صرف ایک مرتبہ محبت کے مفہوم کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔صرف ایک مرتبہ۔وہ ہمیں مخاطب کیے بغیر دھیمی آواز میں بولا۔گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔۔۔صرف ایک مرتبہ جب مجھے کنڈ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

کنڈ۔۔وہ کیا چیز ہے جناب؟ راز نے پوچھا۔

چپ شریف کی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ایک نشیبی مقام ہے۔ایک سبز پیالہ جس کے پیندے میں ایک نیلی جھیل ہے۔جس کے عین بیچ میں مغلیہ طرز کا محل بنا ہوا ہے۔

لیکن اس مقام کو محبت کے جذبے سے کیا تعلق؟ میں نے کہا۔

پتہ نہیں کیوں بوڑھے نے کہا۔لیکن کچھ مقامات ایسے ہیں جن کے ساتھ خصوصی تاثر وابستہ ہے۔دس بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایسے مقامات ہیں جہاں جا کر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کی گود میں آ بیٹھا ہے۔دنیا کے سب بندھن کٹ جاتے ہیں۔ایسے مقامات میں جہاں مایوسی چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔کافرستان کے راستے میں مجھے ایک ایسے مقام پر ٹھہرنا پڑا جہاں غم دکھ اور درد کی دھار کا گھاؤ کھانے کی لت پڑ جاتی ہے۔وہاں کی روئی روئی عورتوں کو دیکھ کر متبسم چہروں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔کانگڑے کی پہاڑیوں میں۔۔۔

لیکن کنڈ کا کیا اثر ہے''؟ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

کنڈ،اس کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں۔کنڈ میں رہنے سے دبی ہوئی محبت ابھر آتی ہے۔وہ پردے اتر جاتے ہیں جن میں ہم نے محبت کو ملفوف کر رکھا ہے۔بہروپ اتر جاتا ہے۔روپ ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس روز بوڑھے کی بات میرے لئے ایک سڑی کھوسٹ کے ہذیان کی حیثیت رکھتی تھی۔جلد ہی لاہور پہنچ کر ہم مرجینا میں کھو گئے۔اور بوڑھے کی بات اور اس کی شخصیت

ہمارے ذہن سے اتر گئی۔

مرجینا سے شادی ہونے کے چار سال بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا اہم راز بے تکلف دوست راز روز بروز اسم بہ مسمیٰ بنا جا رہا ہے۔روز بروز اس کے گرد راز کا پردہ دبیز تر ہوتا جا رہا ہے اور وہ پردہ پھیل رہا ہے پھیلتا جا رہا ہے اور مرجینا اس پردے کی اوٹ میں آئے جا رہی ہے۔پتہ نہیں کیوں جب بھی میں مرجینا کے پاس ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ راز کہیں قریب ہی ہے،بہت قریب۔

تخلیے میں یہ احساس بہت بڑھ جاتا میں محسوس کرتا کہ راز پردے کے پیچھے سے ہماری طرف جھانک رہا ہے۔اس کی آنکھیں میرے سامنے معلق ہو جاتیں اور مرجینا کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا جیسے کہ وہ راز کی معلق آنکھوں کے لئے کوئی کردار ادا کر رہی ہے۔ایک روز مرجینا کی لاپرواہی اور بے حسی سے زچ ہو کر میں نے مرجینا سے کہا مرجینا تمہیں تو مجھ سے محبت تھی۔

معاً مرجینا کے بائیں شانے سے بوڑھے کا سلوٹوں بھرا چہرہ ابھرا۔اس کے ہونٹ ہلے۔صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو۔

اس روز پہلی مرتبہ میں نے اُس بوڑھے کے پیغام کو سنا۔

اس کے بعد ہمارے گھر کا منظر ہی بدل گیا۔گویا میں علی کی بجائے علی بابا بن گیا۔یوں محسوس ہونے لگا جیسے مرجینا اور راز مل کر آہستہ آہستہ مجھے ایک مٹکے میں بند کر رہے ہیں۔پھر مٹکے کے اندر سے میں نے دیکھا کہ مرجینا مٹکے میں انڈیلنے کے لئے تیل کی کڑاہی گرم کر رہی ہے۔ٹپ ٹپ ٹپ،ابلتے ہوئے تیل کی بوندیں گرنے لگیں۔

اس کے دو سال بعد جب مرجینا کے پُر زور مطالبہ کے بعد میں اسے طلاق دے کر اپنے ویران گھر میں پہنچا تو اکیلے میں میری چیخیں نکل گئیں۔

برآمدے کے ستون سے بوڑھے نے سر نکالا۔ صاحبزادے، وہ بولا، ''کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو''۔ اُس روز بوڑھے کا یہ جملہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ میں محبت کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ بوڑھے نے سچ کہا تھا۔ بہت فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ کو احساس ہو کہ آپ محبت کا مفہوم نہیں سمجھتے تو بہت فرق پڑ جاتا ہے۔۔۔ اس روز میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس مقام پر جاؤں جہاں بوڑھے نے محبت کے مفہوم کی ایک جھلک دیکھی تھی۔۔۔ لیکن مجھے اس مقام کا نام یاد نہ تھا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ ذہن پر زور دیا۔ بہت سر مارا لیکن بے کار۔ کئی ایک دن میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ بوڑھے کو ڈھونڈ نکالوں۔ اس مختصر سے پتے کے مطابق جو بوڑھے نے مجھے دیا تھا میں اس کی تلاش میں نکل گیا۔ دو ماہ کے بعد جب میں بوڑھے کے گھر میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں مایوس ہو گیا۔ لیکن اس عرصے میں اس مقام کی تلاش میرے نفسِ غیر شاعر میں جڑیں پکڑ چکی تھی۔۔۔ دو سال بیت گئے۔

ایک روز جب میں نشاط سینما کے برآمدے میں کھڑا آنے والی فلموں کے پوسٹر دیکھ رہا تھا تو یکا یک میرے دل میں ہوائی سی چھوٹ گئی، ''کنج تنہائی''، کنج، کنج، کنڈ، کنڈ۔۔۔ کنڈ میں چلاتا ہوا دیوانہ وار بھاگا۔ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اور میں یوں بھاگا جا رہا تھا جیسے کوئی کھل جا سم سم پا لیا ہو۔ لیکن جلد ہی میری خوشی ختم ہو گئی۔

میں نے ہر جگہ پوچھ گچھ کی۔ ریلوے کے متعلقہ عملے سے ملا۔ پی ڈبلیو ڈی سے تحقیقات کیں۔ ٹورسٹ بیورو سے ملا۔ جغرافیہ دانوں سے بات کی۔ جغرافیائی انسائیکلو پیڈیا دیکھے۔ سروے کے نقشے دیکھے۔ لیکن کنڈ کا پتہ نہ چلا۔

ٹورسٹ بیورو میں جب میں نے کنڈ کے متعلق تفصیلات بتائیں تو وہ کہنے لگے۔ ایسا ایک مقام تو ہے جس کی ایک سڑک حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ وہ ایک سبز پیالہ ہے جس کے درمیان نیلی جھیل ہے اور جھیل میں خصوصاً غیر ملکی سیاحوں کے لئے ہم نے ایک ماڈرن ہوٹل کھولا ہے لیکن اس مقام کا نام کنڈ نہیں جام ہے۔

جی نہیں میں نے جواب دیا۔ خالی جام کو کیا کرنا ہے۔ پیالے اور جھیلیں کئی جگہ ہوں گی۔ میں تو کنڈ کو تلاش کر رہا ہوں۔

ایک سال تک میں نے کنڈ کی تلاش جاری رکھی۔ پھر آہستہ آہستہ میں مایوسی میں ڈوب گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ دنیا داری اور دستور کی رسومات اور فرائض کا ملبہ مجھ پر ڈھیر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ میں ایک چلتا پھرتا مرقد بن کر رہ گیا اور کنڈ کی جستجو میرے دل سے اتر گئی۔

اتفاقاً ایک کاروباری سلسلے میں مجھے اوگی پہاڑ پر آنا پڑا۔ وہاں قاضی صاحب سے ملاقات ہوئی اور قاضی صاحب نے مجھے روشن شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے پر اکسایا۔

اس گھومتی ہوئی بنجر پہاڑی پر رینگتی ہوئی پگڈنڈی پر قاضی صاحب کے محبت کے تذکرے پر پتھر کی اوٹ سے سالہا سال بعد بوڑھے نے سر نکالا۔ صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو۔ ایک بار پھر اس جانے پہچانے جملے نے مجھے جھنجھنا کر رکھ دیا۔ پرانی یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ ماضی کے سرخ چنیونٹے پھر سے میرے دل و دماغ پر رینگنے لگے۔ کنڈ جانے کی دبی ہوئی آرزو پھر سے بیدار ہو گئی۔

روشن شاہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ میاں، وہ بولے۔ محبت کے مفہوم کو جانا جا سکتا ہے۔ لیکن نہ ہم جانتے ہیں، نہ تم جانتے ہو۔ نہ ہم جان سکتے ہیں، نہ تم جان سکتے ہو۔ اگر جان لیں تو ہم ہم نہیں رہتے، تم تم نہیں رہتے۔ لیکن شاہ صاحب مجھے جاننے کی تمنا ہے۔ میں نے کہا۔ شاہ صاحب مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں اُس بوڑھے کی سی تلخی نہ تھی۔ دکھنہ

تھا۔ بولے کس جھنجھٹ میں پڑ گئے میاں گلاب کو جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے گلاب بن جاؤ۔۔۔لیکن پھر جاننے والا نہ رہے گا۔

اگرچہ شاہ صاحب کی باتوں پر قاضی صاحب دیر تک سُبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرتے رہے لیکن میری تسکین نہ ہوئی بلکہ خلفشار اور بھی بڑھ گیا۔ شاہ صاحب کے گاؤں سے واپسی پر کچھ دیر پہلے جب قاضی صاحب مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے اور میں عام مہمان خانے میں بیٹھا بیتے دنوں کی یاد میں کھویا ہوا تھا تو دفعتہً کنڈ کا نام سن کر میں چونکا۔

قریب ہی چارپائی پر دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

اُونچا لمبا ادھیڑ عمر کا آدمی، دبلے پتلے بوڑھے سے کہہ رہا تھا، مشکل سے ایک دن کے لئے آیا ہوں چاچا۔ شاہ صاحب کو سلام کرنے کے لئے کل ہر صورت مجھے واپس پہنچنا ہے۔

دیوانہ وار میں ان کی طرف جھپٹا۔ آپ کنڈ کی باتیں کر رہے تھے کیا۔۔۔آپ نے ابھی کنڈ کا نام لیا تھا۔۔۔آپ جانتے ہیں کنڈ کہاں واقع ہے۔ آپ۔۔۔میں وہاں۔۔۔غالباً وہ میری کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے۔

میں ڈرائیور ہوں اونچا لمبا آدمی بولا۔ دیار سے کنڈ تک میرا روٹ ہے۔ کنڈ سے دو کوس دور میرا گاؤں ہے۔ کنارے کا رہنے والا ہوں۔ تو کیا واقعی کنڈ کوئی جگہ ہے۔ یہاں سے کتنی دور ہے، کہاں ہے، جانے کا راستہ۔۔۔میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ ہاں میں۔ اونچے لمبے آدمی نے سامنے والی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

کنڈ اس پہاڑی کے پار ہے۔ پہاڑی کے پار دورا کی وادی ہے۔ آگے چپ شریف کی پہاڑیاں ہیں۔ بس ان میں کنڈ ہے۔ ادھر سے ڈنڈی جاتی ہے۔ سولہ میل ہے یہاں سے۔

مجھے ساتھ لے چلو بھائی، میں نے کہا۔ مجھے ساتھ لے چلو۔

اس نے غور سے میرا جائزہ لیا۔ پھر سر نفی میں ہلا دیا۔ اونہوں! وہ بولا۔ تم ادھر سے نہیں جا سکو گے بھائی۔ تم سڑک کے رستے جاؤ۔ اوگی سے بس ملے گی۔ دیار کی بس۔ دیار پہنچ کر میرا پوچھ لینا۔ محمد اکبر ڈرائیور۔ میں تمہیں کنڈ لے جاؤں گا۔ دیار سے کنڈ اسی میل دور ہے۔ صرف اسی میل!

دو روز کے بعد دیار پہنچ کر محمد اکبر کو تلاش کرنے میں چنداں دِقت نہ ہوئی اور اگلے دن ہم اس کی جیپ میں بیٹھے کنڈ جا رہے تھے۔ جیپ میں ہم کل چھ افراد تھے۔ پانچ مرد اور ایک عورت۔ جیپ کا ڈرائیور محمد اکبر، ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک بوڑھا ڈاکٹر، پچیس سال کا ایک نوجوان، تیس پینتیس سال کا ایک یورپین، پینتیس سال کی ایک خاتون اور میں۔ خاتون کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مردانہ عورت ہے یا زنانہ مرد۔ اس کا قد اونچا لمبا تھا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ اعضاء بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ چہرے سے تمکنت اور حکومت ظاہر ہوتی تھی۔ نگاہ میں دبدبہ اور بے باکی تھی۔

دیر تک ہم سب چپ چاپ بیٹھے اس ویران بنجر پتھریلے علاقے کو دیکھتے رہے جس پر کوئی درخت نہ جھاڑی۔ چشمہ تھا نہ آبادی۔ ان ریتلی چٹانوں سے عجیب قسم کی سڑانڈ آ رہی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ مردار ویرانہ! یہ کیسا علاقہ ہے ڈاکٹر نوجوان چلایا! گھاس کا ایک پتہ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ چرند نہ پرند۔۔۔اور یہ بُو۔۔۔دماغ پھٹا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ ''میاں'' وہ بولا ''ٹورازم والوں نے تو بہت تعریف کی تھی۔ کہتے تھے دنیا کے چند حسین مقامات میں سے ایک ہے۔ ٹورازم والوں کی بات چھوڑیئے ان کا بس چلے تو سانگلہ ہل کو بھی صحت افزا مقام بنا دیں۔ نوجوان بولا۔ پھر یورپین کی طرف

دیکھ کر بولا۔

ہے ہاؤیو؟

یورپین نے ناک سے رومال ہٹایا۔ ناک چڑھائی۔ کندھے جھٹکے۔ nasty وہ بولا۔ ہاؤفارازاٹ۔

کتنی دور ہوگا ڈرائیور۔ نوجوان نے پوچھا۔

کنڈ۔۔۔؟ بابوجی ڈرائیور بولا۔

ارے روکو روکو نوجوان چلایا۔ تو ہمیں کہاں لے جارہا ہے؟

ایک ہی بات ہے صاحب۔ ڈرائیور نے کہا۔

کیا کہا کنڈ اور جام۔۔۔ ایک ہی بات ہے؟

ٹھیک کہتا ہے۔ ڈاکٹر بولا۔ جام کو کنڈ ہی کہتے ہیں۔ پہلے اس کا نام کنڈ تھا۔ پھر مغلوں کے زمانے میں جہانگیر نے اس مقام کو بہت پسند کیا اور اس کا نام جام رکھا۔ میں نے جگہ جگہ سے اس مقام کے متعلق بہت معلومات حاصل کی ہیں۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کوئی مقام نظر بھی آئے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے بنجر اور مردار چٹانیں نظر آرہی ہیں۔ اس کوڑے کے ڈھیر میں کیا ہوسکتا ہے بھلا۔

لیکن کتابچے میں تو بڑی تعریف لکھی تھی۔ ڈاکٹر بولا۔

کتابچے تو گمراہ کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ نوجوان نے مجھے کہنی ماری۔

کیوں صاحب۔۔۔ آپ کی تعریف۔

جی۔۔۔ مجھے علی کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔

میرا نام عاصم ہے۔ نوجوان بولا۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ ڈرائیور ہمیں غیر علاقے میں لے جائے گا اور وہاں جا کر بیچ دے گا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنسا۔ میاں ہمیں کون خریدتا ہے۔

ہاؤفار۔۔۔ یورپین نے اپنا سوال دہرایا۔

وی آر لاسٹ مین۔۔۔ لاسٹ ان دس گاڈ فارسیکن لینڈ۔ عاصم نے منہ بنا کر کہا۔ یورپین نے دانت نکالے، شانے جھٹکے اور منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ عاصم غور سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کسی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ یورپین ناک پر رومال رکھے ایک انگریزی مصور رسالہ دیکھنے میں محو تھا اور محترمہ مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے آنکھیں دکھا رہی ہو۔ اس کا چہرہ بالکل روکھا تھا۔ کڑوا جیسے ابھی ابھی کوئی کڑوی دوا پی ہو۔

اس محترمہ سے کوئی پوچھے۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔

محترمہ کہاں وہ تو خالص محترم دکھائی دیتی ہے۔ عاصم نے زیرِ لب کہا۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

ان فرنگیوں کو تو دور دراز مقامات پر جانے کا خبط ہے۔ عاصم بولا۔

وہ تو ہے لیکن عورتوں کا کنڈ جانا کچھ مناسب نہیں۔ ڈاکٹر بولا۔

کیوں! عاصم نے پوچھا۔

کہتے ہیں اس جگہ ایک خصوصی تاثیر ہے۔ جو بھی وہاں جائے اس کے دل میں دبی ہوئی محبت اُبھر آتی ہے۔ اپنے اصلی روپ میں اُبھر آتی ہے۔ دل کی گہرائیوں میں ایک ابال آجاتا ہے۔ ایک طوفان چلتا ہے۔ پرانے زمانے میں دید شوقین مزاج بوڑھوں کو کنڈ آنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

اچھا۔۔۔ کہیں آپ بھی تو اسی سلسلے میں نہیں جارہے۔

ڈاکٹر ہنسا۔۔۔ میں تو تحقیق کے لئے جارہا ہوں۔

مرض کی تحقیق یا کسی مریض کی۔ عاصم نے پوچھا۔

میں میڈیسن کا ڈاکٹر نہیں میاں ،نفسیات کا پی ایچ ڈی ہوں۔

اوہ۔۔۔عاصم نے ڈاکٹر کی طرف بغور دیکھا۔

اس بات کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب درست ہے یا۔۔۔۔

کیا واقعی کنڈ محبت کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

یہ یورپین بھی کیا محبت کی ہولی کھیلنے آیا ہے۔ عاصم نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ یہ تو ہر جگہ محبت کی ہولی کھیلتے ہیں۔ان مغربی لوگوں نے تو جگہ جگہ کنڈ بنا رکھا ہے۔مسلسل کنڈ میں رہتے ہیں بلکہ اب تو کنڈ سے اکتا چکے ہیں۔

ڈاکٹر کی باتیں میں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اس سے کچھ پوچھوں۔ دل میں کئی ایک سوال ابھر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ، میں نے پوچھا۔کیا آپ محبت کا مفہوم جانتے ہیں۔ ڈاکٹر نے غور سے میری طرف دیکھا۔اندھے اور ہاتھی والی بات ہے میاں۔ وہ بولا۔کوئی سمجھتا ہے کہ رسے کی طرح ہے۔کوئی سمجھتا ہے ستون ہے۔کسی کو چھاج معلوم پڑتی ہے۔کسی کو سونڈ۔انا اور جسم کے چشمے سے دیکھو تو ، ذاتی بن جاتی ہے۔ذاتی محبت کی پھلجھڑیاں رنگ رنگ میں جلتی ہیں۔ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا۔میاں محبت دیوتا بھی ہے اور عفریت بھی۔کبھی وہ دیوتا کو عفریت میں بدل دیتی ہے کبھی عفریت کو دیوتا۔۔۔

خواہ مخواہ۔۔۔ عاصم نے ہنس کر کہا۔ روحانیت کی کلی ٹانک کر خواہ مخواہ بات کو الجھا دیا۔

جنہوں نے روحانیت کو الگ کر کے محبت کو جسم تک محدود کر دیا ہے ان کا حشر دیکھ

رہے ہو نا میاں ڈاکٹر بولا۔

کن کی بات کر رہے ہیں آپ؟ عاصم نے پوچھا۔

اہل مغرب کی۔وہ بولا

کتنی عجیب بات ہے عاصم گنگنایا۔جسم میں مقید لوگ آزادی کے خواب دیکھتے ہیں۔خالی خولی خواب۔

کنڈ آ گیا صاحب۔ڈرائیور بولا۔

چھوڑو یار عاصم چلایا۔تم تو کب سے یہی کہہ رہے ہو۔

صرف ڈیڑھ میل ہے یہاں سے۔ڈرائیور نے کہا۔

عاصم نے چاروں طرف دیکھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی بنجر چٹانوں کا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں تو ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔وہ بولا۔کوئی مقام دکھائی بھی دے۔

جیپ رک گئی۔

گاڑی آگے نہیں جائے گی صاحب۔ڈرائیور بولا۔

لیکن۔۔۔عاصم نے کہا۔۔۔کوئی مقام نظر تو نہیں آتا۔

یہ ڈنڈی جو ہے ڈرائیور نے کہا۔صرف آدھ میل پیدل چلنا پڑے گا۔یہ سامنے تو ہے۔اس پتھر سے صاف نظر آئے گا۔

شاید نشیب میں ہے۔ڈاکٹر نے کہا۔

پتھر کے قریب پہنچ کر عاصم نے ایک چیخ سی ماری۔ ڈاکٹر، ڈاکٹر۔۔۔ پھر وہ خاموش ہو گیا اور یوں بے حس وحرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے پتھر کا بنا ہو۔

کنڈ کو دیکھ کر ہم سب مبہوت رہ گئے۔ نیچے ہمارے سامنے گویا ایک وسیع و

عریض سبز کٹورہ دھرا تھا۔ دیواروں میں گولائی تھی جو سبز مخملی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی جس میں سے گلابی اور نیلے پھول جھانک رہے تھے۔ دیواروں کے اوپر تین طرف اونچے لمبے دیودار کھڑے تھے۔ کٹورے کی تہہ میں جھیل میں نیلا پانی چمک رہا تھا اور جھیل کے عین وسط میں ایک سہ منزلہ عمارت یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے گڑیوں کا گھر ہو۔ جھیل کے کنارے چند ماچس کی ڈبیاں رکھی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ مکانات اور دکانیں تھیں۔ کٹورے کی دیواروں پر کوئی درخت تھا نہ پودا۔ صرف گھاس کا پھولدار قالین بچھا تھا۔

ان مردار اور ویران چٹانوں کی ایک کھوہ میں ایسا سرسبز اور دلفریب مقام۔ دیر تک ہم سب اس حسین سبز کٹورے کو دیکھتے رہے۔ لیکن ہوٹل میں پہنچ کر جب ہم نے ٹیرس سے دیکھا تو منظر کا حسن دوبالا ہوگیا۔ نیلگوں پانی کے پھیلاؤ سے کٹورے کی دیواریں اور بھی مخملی نظر آنے لگیں۔ ان کی گولائی اور بھی واضح ہوگئی۔

شام کے وقت ٹیرس پر چائے پیتے ہوئے میں دل میں ایک عجیب سی فرحت محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہاں پہنچ کر دل سے سالہا سال کا بوجھ اتر گیا ہو۔ بیتے ہوئے دکھ گویا اپنی دھار کھو چکے تھے۔ ماضی کی تلخیاں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے عمر رفتہ ایک خواب ہو۔ محض دھندلا خواب، بے معنی خواب۔

دیر تک میں ٹیرس پر بیٹھا رہا۔ پھر سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ سفر کی تھکان کی وجہ سے جلد نیند آجائے گی لیکن دیر تک بستر پر پڑے رہنے کے باوجود نیند نہ آئی۔ سونے سے پہلے بیتے ہوئے واقعات پر سوچنے کی میری پرانی عادت اس رات گویا منسوخ ہوگئی تھی۔ ماضی ایک بے معنی دھندلکا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان بیتے ہوئے واقعات سے میرا کوئی خاص تعلق نہ ہو جیسے وہ کسی اور سے متعلق ہوں۔ رہ رہ کر دھیان حال کی طرف منعطف ہو جاتا۔ جی چاہتا اٹھ کر کچھ کروں۔ کچھ دیکھوں۔ گھڑیال نے ایک

بجایا۔ عین اس وقت باہر سے شور سنائی دیا۔ کون ہو تم؟ کون ہو تم۔

میں اٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

میں ہوں صاحب بیرا۔ برآمدے میں سٹول پر بیٹھا ہوا ایک آدمی بولا۔۔۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو۔ عاصم نے پوچھا۔

میں ڈیوٹی پر ہوں صاحب۔

ڈیوٹی۔۔۔ اس وقت۔

جی صاحب یہاں ساری رات سروس چلتی ہے۔

کیا بات ہے عاصم صاحب۔ میں نے نوجوان سے باآواز بلند پوچھا۔

اوہ آپ ہیں، وہ بولا۔ کچھ نہیں، پھر دفعتاً بیرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ اس وقت کافی مل سکے گی کیا۔

جی صاحب ابھی لایا۔ بیرا اٹھ کر چل پڑا۔

دو کافی۔۔۔ ہاٹ۔ عاصم چلایا۔ آپ پئیں گے نا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ آیئے بیٹھئے۔۔۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔۔۔ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔

ہم دونوں برآمدے میں لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ارے عاصم چلایا۔۔۔ اُدھر دیکھئے تو۔

چاند بدلی سے باہر نکل آیا تھا۔ سبز کوزہ روپہلی چاندنی سے منور ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ دور کوئی آبشار گنگنا رہی تھی۔ اور نہ جانے کہاں سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز سارے ٹیرس پر پھیلی ہوئی تھی۔

ارے صاحب یہ تو خوابوں کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہاں نیند کیوں نہیں آتی۔ عجیب سی بات ہے۔ اور میں سمجھتا تھا وہ ڈاکٹر محض کتابی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا

مقامات، جغرافیہ، آب وہوا کا بھی اثر ہوسکتا ہے۔۔۔لیکن یہاں میں عجیب سا محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے میں میں نہیں رہا۔

کافی سر، قریب ہی اندھیرے سے آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے آہ بھری ہو۔

کون ہے عاصم تڑپ کر مڑا۔

میں ہوں سر۔

ادھر آؤ چاندنی میں۔ وہ بولا۔

میں ہوٹل کی ہاسٹس ہوں سر۔

وہ درمیانہ قد اور ہلکے پھلکے جسم کی لڑکی تھی۔ معمولی سے کپڑے کی جوگیا ساڑھی میں ملبوس۔ چٹا گانگ کی پہاڑی لڑکیوں کی طرح سر پر ایک طرف بالوں کے جوڑے میں سفید پھول لگے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بچگانہ معصومیت تھی۔ آنکھیں ترچھی ڈولتی ہوئی مگر روئی روئی، ہونٹ پتلے جیسے ان میں آہ دبا رکھی ہو۔ چہرہ ستا ہوا۔ آواز مدھم اور لوچدار۔

وہ ہمارے روبرو یوں کھڑی تھی جیسے خوابوں کے دھندلکے سے بنی ہو۔ کافی سر۔

اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

عاصم کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ کیا تم ہمارے ساتھ کافی پیو گی۔ لیکن میں نے تو صرف دو پیالے منگوائے تھے۔ بیرا، بیرا وہ چلایا۔

پاٹ میں تین پیالے ہیں سر۔ وہ کافی بناتے ہوئے بولی۔

شکر ایک یا دو۔

اوہ۔۔۔ایک عاصم نے کہا۔ کیا نام ہے تمہارا۔

آنسہ سر وہ بولی۔

آنسہ، آنسہ، عاصم نے بڑے پیار سے کئی ایک بار اس کے نام کو دھرایا۔ وہ میری موجودگی بھول چکا تھا۔

آنسہ، وہ بولا۔ میں نے تمہیں کل شام کو نہیں دیکھا۔

میں نائٹ ڈیوٹی پر ہوں۔ وہ بولی۔

اوہ۔۔۔ عاصم نے دونوں کہنیاں میز پر رکھ دیں اور جھک کر آنسہ کو دیکھنے لگا۔

آنسہ جھکی جھکی آنکھوں سے پیالے میں چمچہ چلا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے خم سے ظاہر تھا کہ اسے عاصم کی منڈلاتی ہوئی نگاہوں کا احساس ہے۔

تم روئی روئی ہو آنسے، تمہیں کوئی دکھ ہے کیا۔ عاصم نے کہا۔

کافی سر، آنسہ نے اوپر دیکھے بغیر پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت اوپر لی منزل سے کوئی چیخنے لگی۔ اسٹاپ اٹ یو آر ہرٹنگ می ڈارلنگ۔ سٹاپ اٹ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

پھر وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

یہ کون ہے عاصم چلایا۔

اوپر لی منزل بیرونی سیاحوں کے لئے مخصوص ہے وہ بولی۔

لیکن یہ شور شرابا،

یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے سر۔ وہ بولی۔

لیکن تم، عاصم نے کہا۔ اس شور شرابے میں تم خاموشی کی ایک کرن ہو آنسے۔

ایک پیالہ اور بنا دوں سر۔ وہ بولی۔

میری بات کا جواب دو آنسے۔

اس نے ایک موہوم آہ بھری۔ پتہ نہیں سروہ زیرلب گنگنائی۔

ڈاکٹر، ڈاکٹر دور سے آواز آئی۔ ڈاکٹر میرا دل، میرا دل ڈاکٹر۔ ہاتھ رکھ کر دیکھو۔
یہاں یہاں۔۔۔ ہی ہی ہی، قہقہے کی آواز گونجی۔ ڈر گئے، ڈر گئے۔ ہی ہی ہی ہی، مرد ہو کے
ڈرتے ہو۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی جیسے نشہ میں دھت ہو۔ میرا دل ڈاکٹر، میرا دل۔
آواز مدھم پڑتی گئی۔

پھر جیسے کوئی کھانس رہا ہو۔ ہچکیاں بھر رہا ہو۔

کون ہے یہ؟ عاصم چلایا، کون تھا۔

یہ بانو ہے سر، وہ بولی۔ یہاں مکمل آزادی ہے۔ سب اپنی اپنی زندگی بسر کرتے
ہیں۔ کوئی دخل نہیں دیتا کہ کیوں ہے کیا ہے۔

عین اس وقت ساتھ والا کمرہ کھلا۔ منیجر منیجر کوئی چلائی۔

یہ کیسی آوازیں ہیں۔ کیسی آوازیں ہیں۔۔۔ منیجر۔

یہ تو محترمہ ہیں۔ عاصم بولا جو ہمارے ساتھ آئیں تھیں۔

ایک اونچا لمبا سایہ محترمہ کے پاس آکر رک گیا۔ یس میڈیم۔

تم کون ہو؟ محترمہ بولی۔

میں منیجر ہوں میڈم، خاقانی۔

منیجر، محترمہ نے چیخ کر کہا۔ یہ کیسا شور ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی اور یہ موسیقی۔ اسے
بند کرو منیجر اسے بند کرو۔ یہ مجھے سونے نہ دے گی۔ بند کرو اسے منیجر۔

آیئے محترمہ آپ یہاں برآمدے میں بیٹھئے، میں آپ کو سلیپنگ پلز بھجواتا ہوں۔
کیا آپ کافی پینا پسند کریں گی؟

دفعتہ محترمہ کی نگاہ منظر پر پڑی۔ اُف یہ چاندنی وہ گنگنائی۔ اُف یہ چاندنی۔ اور

ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ محترمہ نیند نہیں آئی آپ کو۔ عاصم نے برسبیلِ
تذکرہ پوچھا۔

وہ چونکی، تم کون ہو؟ وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

میں آپ کا ہمراہی ہوں عاصم نے کہا۔

ہمراہی، محترمہ نے نفرت بھری نگاہ سے عاصم کی طرف دیکھا۔۔۔ اوہ تم دفعتہ
اس کی آواز میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ہاں تم وہ گنگنائی۔ لیکن تم ہمراہی نہیں ہو۔ کوئی ہمراہی نہیں
ہے۔ میں تو اکیلی ہوں۔ اکیلی سر ہاتھوں میں تھامے وہ آپ ہی آپ گنگنائی رہی تھی۔ پھر
اس نے سر اٹھایا۔ دفعتہ اس کی نگاہ آنسہ پر پڑی۔۔۔ تم۔۔۔ وہ چلائی۔۔۔ تم کون ہو؟

میں ہاسٹس ہوں آنسہ۔

محترمہ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اسے یہ قطعی احساس نہ رہا تھا کہ ہم
پاس بیٹھے ہیں۔ وہ اٹھ بیٹھی اور آنسہ کے قریب تر ہوگئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے آنسہ کی
ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ تم یہاں ہو۔ اور میں کب سے
تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ کب سے۔ صدیاں بیت گئیں۔ آنسے میری طرف دیکھو آنسے۔

لیکن میڈم۔۔۔ آنسے نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

تم میرا خواب ہو، میری طرف دیکھو آنسے۔ محترمہ کی آواز میں منت تھی۔

بیگم صاحبہ۔۔۔ یہ نیند آور گولیاں۔ بیگم صاحبہ، بیرے نے آکر محترمہ سے کہا۔
منیجر نے بھیجی ہیں۔

نہیں نہیں، محترمہ چلائی۔ مجھے نہیں چاہیں، مجھے نہیں چاہیں، میں سونا نہیں
چاہتی۔ میں جاگنا چاہتی ہوں۔ جینا چاہتی ہوں۔۔۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔۔۔ آنسہ جا
چکی تھی۔ ہائیں چلی گئی۔ محترمہ نے چیخ سی ماری۔۔۔ چلی گئی۔ اور پھر وہ آنسے کے پیچھے

بھاگی۔آنسے آنسے۔رک جاؤ آنسہ رک جاؤ۔

آنسہ، عاصم نے زیرلب کہا۔آنسہ۔۔۔آنسو۔۔۔ہاں وہ گنگنایا۔۔۔وہ آنسو ہے۔

عجیب لڑکی ہے۔میں نے کہا۔غیر معمولی۔

عاصم نے حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے دفعتاً اسے میری موجودگی کا احساس ہوا ہو۔آپ وہ بولا۔آپ یہاں۔۔۔آپ کب آئے۔اوہ اچھا۔آپ معاف کرنا علی صاحب اس نے کہا۔سارا ذہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔

ہی ہی ہی، قریب ہی سے ڈاکٹر کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔سچ کہتے ہو میاں، وہ قریب آ کر بولا۔واقعی سارا ذہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔یہ فضا عجیب کیفیات کی حامل ہے۔یہاں نیند نہیں آتی۔سفر کی کوفت کے باوجود تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ایک عجیب سی فرحت محسوس ہو رہی ہے۔کیوں علی صاحب۔وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

فرحت تو بے شک ہے، میں نے جواب دیا۔لیکن ساتھ ہی ایک اضطراب سا طاری ہے ارے صاحب، عاصم بولا۔میرا تو جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر ناچوں۔ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔

لیکن ڈاکٹر، عاصم نے کہا۔وہ لڑکی آنسہ، آپ نے اسے دیکھا ہے۔اسے گویا وہ اس گلابی جام سے ڈھلکا ہوا نیلگوں آنسو ہے۔جیسے راگ میں بے بربت سر ہوتا ہے۔جسے لگانا منع ہوتا ہے مگر لگ جائے تو اور بھی دل کشی پیدا کر دیتا ہے۔تم نے اُسے دیکھا ہے ڈاکٹر؟

ہاں میں نے آنسہ کو دیکھا ہے۔ڈاکٹر بولا۔

دور سے نسوانی قہقہے کی آواز آئی۔شرابی خاتون بانو ہنسے جا رہی تھی۔۔۔میں جام کا تلخ گھونٹ ہوں، وہ بہکی آواز میں چلائی۔تم مجھے نہیں جانتے کیا؟

اوپر کی منزل سے کوئی میم چلائی۔کرش میں ڈارلنگ کرش می۔پھر مردانہ قہقہہ گونجا۔

آنسہ، ڈاکٹر بولا۔وہ ان قہقہوں پر لرزتا ہوا ایک آنسو ہے۔تم ٹھیک کہتے ہو۔یہ قہقہے، یہ رنگین تبسم اور یہ آنسو، زندگی کی قوس قزح کتنی رنگین ہے۔یہاں کوئی تیرنے کی دعوت دیتی ہے کوئی ڈوب جانے کی۔

لیکن کیوں۔۔۔کیوں؟ محترمہ کی اشک بار آواز سنائی دی۔

آپ نہیں سمجھتی بیگم صاحبہ۔منیجر بولا۔آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔آیئے میں آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔

منیجر نے دروازہ کھولا۔محترمہ روتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔اس کی ہچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔منیجر ہمارے قریب آ کر بولا۔

ادھر آیئے منیجر۔ڈاکٹر بولا۔کیا قرب و جوار میں کوئی دیکھنے کی جگہ ہے یہاں۔

خاقانی اندھیرے سے نکل کر چاندنی میں آ کھڑا ہوا۔جھیل کے پار ادھر مشرق میں ایک راہب خانہ ہے۔وہ بولا۔کہتے ہیں اشوک کے زمانے میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔لیکن جلد ہی بودھ راہبوں نے محسوس کیا کہ کنڈ دھیان گیان کی جگہ نہیں۔کہتے ہیں بہت سے راہب پاگل ہو گئے تھے۔جب سے راہب خانہ ویران پڑا ہے۔

خاقانی کی طرف دیکھتے ہوئے دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے وہ ایک جانا پہچانا چہرہ ہو۔کون ہے یہ؟ میں سوچنے لگا۔

راہب خانے کو جانے کا کوئی راستہ ہے کیا۔ڈاکٹر نے پوچھا۔

آپ کشتی سے جا سکتے ہیں۔خاقانی نے جواب دیا۔جھیل میں سیر کرنے کے لئے

ہم نے ایک کشتی بنوا رکھی ہے۔ پھر خاقانی نے عاصم کو مخاطب کر کے کہا۔ آپ نے بارہ دری نہیں دیکھی صاحب۔

بارہ دری، عاصم نے دہرایا۔

بارہ دری سے منظر بہت خوبصورت ہے۔ وہ اسی ٹیرس پر ہے لیکن مشرقی جانب۔

چلیئے مجھے دکھائیے۔ عاصم بولا۔

نہیں، خاقانی بولا۔ اب پو پھٹنے کو ہے۔ بارہ دری کا نظارہ چاندنی رات میں بہار دکھاتا ہے۔ میں آنسہ سے کہہ دوں گا۔ کل رات وہ آپ کو بارہ دری میں لے جائے گی۔

آنسہ آپ کی ملازمہ ہے کیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

نہیں خاقانی بولا۔ وہ میری حصہ دار ہے۔ تفریحاً ہاسٹس کا کام کرتی ہے۔ اچھا مجھے اجازت دیجئے۔ شب بخیر۔

دفعتاً میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ میرے سامنے خاقانی کے بھیس میں راز کھڑا تھا۔ وہی میرا پرانا رازداں راز۔۔۔

کیا بات ہے میاں، ڈاکٹر نے کہا۔

خیریت تو ہے عاصم نے پوچھا۔

خاقانی جاتے جاتے رک گیا۔

کچھ نہیں کچھ نہیں میں چلایا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

پھر کمرے میں لیٹے ہوئے ماضی کی ایک ایک تفصیل میرے سامنے آ رہی تھی۔

راز اور مرجینا مجھے گھیر کر مٹکے میں بند کر رہے تھے۔ مرجینا تیل گرم کر رہی تھی۔ راز گرم تیل مٹکے میں انڈیل رہا تھا۔ ٹپ ٹپ، بوندیں گر رہی تھیں۔

لیکن اس آپ بیتی کو دوبارہ بیتنے سے مجھے وہ اذیت نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے محسوس

ہو رہا تھا جیسے میں اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنا ہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ساری بات پر ہنسی آ رہی تھی۔ کیا بوڑھے پروفیسر کا یہی مطلب تھا۔ کیا محبت کی یہی وہ جھلک تھی جو اس نے کنڈ میں آ کر دیکھی تھی۔۔۔ اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنی محبتوں پر ہنسنا۔ بیتے ہوئے دکھوں پر مسکرانا۔۔۔ لیکن راز۔۔۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ اس میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی۔ بھویں گھنی ہو گئیں تھیں۔ آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔ چہرے پر گویا دکھی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ دکھ کی ایک تہہ چڑھ گئی تھی۔

اور وہ اس کی حصہ دار۔۔۔ معصوم آنسہ۔۔۔ کیا وہ اس کی مرجینا بھی۔ میرے دل میں تحقیق کی خواہش ابھر رہی تھی۔ غصہ، نفرت، عناد سے بے نیاز جذبہ تحقیق۔

اگلے روز سارا دن ہم جھیل کے مشرقی کنارے پر راہب خانے کو دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر ہمیں راہبوں کی زندگی اور بودھوں کا فلسفہ عبادت سمجھاتا رہا۔ پھر وہ تبت کے قصے سنانے لگا۔ وہ تبت سے ہو آیا تھا۔ ان دنوں وہاں گیا تھا جب جملہ تبتی چین کے متوقع حملے کی تیاری میں مصروف تھے۔ انہیں علم تھا کہ تبتی تہذیب ختم ہونے والی تھی۔ انہیں علم تھا کہ ان کا سربراہ آخری لامہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ڈاکٹر کی باتوں میں ایک عجیب سحر تھا۔

لیکن ڈاکٹر، عاصم چلایا۔ یہ راہب خانہ ویران کیوں ہو گیا۔

یہ جگہ بڑی ڈسٹربنگ ہے میں، وہ بولا۔ راہب کا مقصد دنیا کو تیاگنا نہیں، اپنی انا کو تیاگنا ہے۔ اس سنہرے پنجرے سے باہر نکلنا ہے جسے انا کہتے ہیں۔ بودھ راہبوں نے انا کو توڑنے کے لئے اندھیرا تنہائی اور خاموشی کو آلہ کار بنایا۔ حجرے میں داخل ہو کر وہ دروازے کو چنوا دیتے تھے اور سالہا سال اندر بیٹھ رہتے تھے۔

اور اندر کیا کرتے تھے۔ عاصم نے پوچھا۔

عبادت، دیان گیان، یہ بھی ایک قسم کی محبت ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ہنسا۔

بڑی کٹھن محبت ہے۔ عاصم بولا۔

محبت کوئی بھی ہو، خدا کی ہو بندوں کی ہو۔ مقصد پانا نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو کھونا ہوتا ہے۔ انا کی دیوار کو توڑ دو تو تم بنفس نفیس محبت بن جاتے ہو۔ ڈاکٹر نے کہا۔

راہب خانے کی دیوار سے روشن شاہ نے جھانکا۔ مسکرائے گلاب کو جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے میاں وہ بولے۔ خود گلاب بن جاؤ، لیکن پھر جاننے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس جاننے کے جھنجھٹ سے ہی نکل جاؤ گے۔

لیکن جاننے کے جھنجھٹ سے نکلنا کس قدر مشکل تھا۔ اسی جاننے کے جھنجھٹ کی وجہ سے میں کنڈ آیا تھا۔ لیکن کنڈ پہنچ کر میں ایک اور جھنجھٹ میں پھنس گیا تھا۔ وہ جھنجھٹ راز تھا۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات راز پر نظر رکھی۔ بارہ دری کے قریب جب میں ایک اندھیرے کونے میں چھپ کر کھڑا تھا تو ملحقہ نیم چھتی سے راز نے سر نکالا۔ آنسہ، آنسہ وہ چلایا۔ جاؤ اسے بارہ دری میں لے آؤ۔ آنسے سمجھ گئی۔

کچھ دیر بعد آنسہ بارہ دری سے نکلی اور مغربی ٹیرس کی طرف چل پڑی۔ اس کے جانے کے بعد میں بارہ دری میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک فراخ سا کمرہ تھا جس میں چاروں طرف دیواروں کے ساتھ شلف لگے تھے۔ جن میں کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے ایک شلف کا جائزہ لیا۔ سب کی سب کتابیں ایک ہی موضوع پر تھیں۔ رومان، ملک ملک کے رومان۔

گریٹ لوسٹوریز، ایک محبت سو افسانے، ورائیٹز آف لو۔

بارہ دری سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں صرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ چھوٹی میز پر تصویروں کا البم تھا۔ جس میں برہنہ تصویریں تھیں۔ وینس، کیوپڈ اینڈ سائیکی۔ بشانٹنے، دی ولگا۔ اتفاقاً میری نگاہ دیوار پر پڑی۔ دیوار پر ایک چھوٹا سا جھروکا تھا لیکن وہ جھروکا معلوم نہیں دیتا تھا۔ جیسے خوب صورتی کے لئے چھوٹا سا فریم لگا ہو۔ ضرور وہ

جھروکا اس نیم چھتی میں کھلتا ہوگا۔ جس میں سے راز نے آنسہ کو آواز دی تھی۔ میں نے سوچا۔

آنسے، قریب ہی عاصم کی آواز آئی۔ وہ لائبریری کی طرف آ رہے تھے۔ میں ایک شلف کے پیچھے چھپ گیا۔ دراصل آنسہ اور عاصم کی باتیں سننا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں یہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے آنسہ ایک پلاسٹک کی گڑیا ہو جس کی ڈور راز کے ہاتھ میں ہو۔

یہاں سے منظر بڑا خوبصورت ہے سر، آنسہ بولی۔

یہ کنڈ، عاصم بولا۔ آنسے یہ کنڈ تو صرف ایک منظر ہے۔ پس منظر تو صرف تم ہو آنسے۔

آیئے بھی۔۔۔ آنسہ نے عاصم کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ دیکھئے یہ لائبریری ہے۔ وہ بارہ دری میں داخل ہو کر بولی۔ آپ کتابیں دیکھنا پسند کریں گے۔

کتابیں تو انسان اس وقت پڑھتا ہے آنسے جب وہ بیت نہ رہا ہو۔ میں تو بیت رہا ہوں آنسے۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے آنسے۔

آیئے آپ کو دنیا کے عظیم عمل دکھاؤں۔ گریٹ پینٹنگز۔ وہ عاصم کو ملحقہ کمرے میں لے گئی۔

کیا ان میں تمہاری تصویر بھی ہے۔ وہ بولا۔

یہ دیکھے محبت کی پہلی بیداری۔ عاصم تصویر دیکھنے لگا۔ آنسہ دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کتنا خوبصورت ویو ہے اس دروازے سے وہ بولی۔

ہاں۔۔۔ بشرطیکہ تم پاس کھڑی ہو۔ عاصم نے کہا۔

کافی پئیں گے آپ؟ وہ بولی۔ بیٹھئے ابھی بناتی ہوں۔

ضرور ضرور، عاصم نے کہا۔ لیکن اس کمرے میں تو صرف ایک کرسی ہے۔

دوسری کی جگہ ہی نہیں۔ وہ پرکولیٹر کے قریب کھڑی ہنسنے لگی۔

میں میز پر بیٹھ جاتا ہوں وہ بولا۔

نہیں نہیں آنسہ چلائی پلیز۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔

ارے عاصم نے کہا۔ یہ دیوار پر کیا بنا ہے۔ جھروکہ ہے کیا۔

خالی فریم ہے وہ بولی۔ خوب صورتی کے لئے۔

دفعتاً موسیقی بدل گئی۔

ارے یہ موسیقی کس نے بدلی۔ عاصم چلایا۔

پتہ نہیں وہ بولی، شاید آٹو میٹک لگا ہو۔۔۔ کافی لیجئے سر۔ وہ عاصم کی کرسی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

خدا کے لئے آنسہ مجھے سر نہ کہو۔

جیسے آپ چاہیں۔ مجھے عادت پڑ گئی ہے۔ کیا کروں۔ یہ دیکھئے۔ یہ عمر خیام کا البم ہے سر۔۔۔ معاف کیجئے۔۔۔ معاف کیجئے۔ میں بھول جاتی ہوں۔

آنسہ کی آواز یوں بدل گئی جیسے نشے میں ہو۔

بھول جاتی ہوں۔ مجھے چکر آتے ہیں، چکر۔۔۔ جیسے جیسے یہ جھیل یہ ہوٹل سب ایک جھولا ہو۔

آنسے، آنسے، عاصم چلایا۔ کیا ہے تمہیں۔

کچھ نہیں سر، کچھ نہیں۔ تھک گئی ہوں، بہت تھک گئی ہوں۔ دفعتہً وہ چکرا کر دھڑام سے عاصم کی گود میں گر گئی۔

آنسے، عاصم چلایا ہوش کرو آنسے۔

موسیقی پھر بدل گئی۔

آنسہ بے ہوشی میں گنگنا رہی تھی۔ مجھے تھام لو سر میں گری جا رہی ہوں، مجھے تھام لو سر۔

عاصم آنسہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تم دیوی ہو آنسہ تمہیں منایا جا سکتا ہے۔ سیس نوایا جا سکتا ہے۔ تھاما نہیں جا سکتا آنسے۔ تمہاری یہ آنکھیں، یہ بال، یہ ستا ہوا چہرہ۔ مجھے تم سے محبت ہے آنسے، مجھے تم سے محبت ہے۔ عاصم زیر لب بولا۔

ہوش میں آؤ آنسے ہوش میں آؤ۔ نہیں نہیں ہوش میں نہ آنا۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔

دفعتاً لائبریری کے دروازے سے خاقانی داخل ہوا۔

معاف کیجئے گا صاحب وہ عاصم سے مخاطب ہو کر بولا۔۔۔ اوہ آنسہ کو کیا ہوا۔۔۔ پھر بے ہوش ہو گئی۔ دراصل اسے دورے پڑتے ہیں۔ معاف کیجئے آپ کو زحمت ہوئی۔

انہیں گفتگو میں مصروف دیکھ کر میں دبے پاؤں باہر نکل آیا۔

چاندنی اپنے جوبن پر تھی۔ سبز کٹورہ روپہلی چاندنی سے لبریز تھا۔ تیسری منزل سے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

بارہ دری کے مشرقی ٹیرس پر کوئی نہ تھا۔ میں ادھر چلا گیا اور ایک ستون کے سایہ میں بیٹھ کر جھیل کو دیکھنے میں کھو گیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے آوازیں سنائی دیں۔

قریب ہی شرابی خاتون بانو قہقہہ مار کر ہنسی۔ تم نو وارد ہو وہ بولی۔

ہاں ہاں محترمہ، عاصم نے جواب دیا۔

محترمہ۔۔۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ مجھے محترمہ کہتا ہے۔ میں۔۔۔ محترمہ۔ اس کی ہنسی

بھیانک ہوگئی جیسے کراہ رہی ہو۔

غالباً نشے میں ہو۔ عاصم نے کہا۔ تم نے زیادہ پی لی ہے۔

مجھے پینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بولی۔ میں تو آپ نشہ ہوں۔ جام کی تلچھٹ کا تلخ گھونٹ۔ وہ پھر ہنسنے لگی۔۔۔ دفعتاً اس کا انداز بدل گیا۔

تم بارہ دری سے آئے ہو۔ تمہارے کپڑوں سے اس کی بو آ رہی ہے۔ تم مداری کا تماشہ دیکھ کر آئے ہو؟ اس نے قہقہہ مار کر کہا۔۔۔ یہاں جو نوجوان آتا ہے اسے تماشہ دکھایا جاتا ہے۔ دونوں ہی مداری ہیں۔ میاں بیوی مل کر تماشہ کرتے ہیں۔

مداری کا تماشہ، وہ پھر ہنسنے لگی۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔ اس نے آنسہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔ میں گری جا رہی ہوں۔ تھک گئی ہوں۔ مجھے تھام لو سر مجھے تھام لو۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ میاں جھروکے میں، بیوی گود میں۔ تماشہ ختم۔ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

بانو۔۔۔ دور سے خاقانی کی آواز آئی۔ پھر وہ بڑی تیزی سے خاتون کی طرف بڑھا۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ خاقانی نے عاصم سے کہا۔ ان کی طبعیت اچھی نہیں۔ عاصم چلا گیا تو خاقانی بانو سے مخاطب ہوا۔ بانو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔

بے وقوف نہ بنو خاقانی نے زیر لب کہا۔

بے وقوف تم ہو بانو چلائی۔ آنسہ تمہاری بارہ دری کو آباد نہیں کر سکتی۔ تمہارے جھروکے میں خوشی نہیں لا سکتی۔ تمہاری بارہ دری میرے دم سے آباد تھی۔ میرے دم سے وہاں قہقہے گونجتے تھے، زندگی تھی۔۔۔ لیکن تم مجھ سے اکتا گئے۔ تم نے مجھے پرانے کھلونے کی طرح پھینک دیا اور ایک نئی گڑیا لے آئے۔

آہستہ بولو بانو۔۔۔ خدا کے لئے۔ خاقانی نے زیر لب کہا۔

خدا کے لئے راز بانو نے منت سے کہا۔ مجھے پھر سے اپنی ہوسٹس بنا لو۔

میں مجبور ہوں بانو وہ بولا۔

مجبور ہو۔ وہ بولی۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ محروم بھی رہو۔

بے کار ہے بانو خاقانی نے کہا۔

کیا کوئی صورت نہیں۔

صرف ایک صورت ہے خاقانی نے کہا۔ تم کنڈ سے چلی جاؤ۔ تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔

نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں سے کیسے جا سکتی ہوں۔ بانو دیوانہ وار پیچھے ہٹی۔

بانو وہ چلایا۔ رک جاؤ، ادھر ٹیرس پر ریلنگ نہیں ہے، بانو رک جاؤ۔

بانو قہقہہ مار کر ہنسی۔ تم مجھے روکنے والے کون ہو۔

خطرے کا احساس کر کے میں خاتون کی طرف لپکا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ معاً اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔۔۔ تم وہ چلائی، تم۔۔۔ اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ مرجینا، بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مرجینا دیوانہ وار بھاگی اور اس نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔

ٹیرس پر کہرام مچ گیا۔

میری نگاہوں تلے ایک دھندلکا چھا گیا اور میں اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

اگلے روز جب میں بیدار ہوا تو ڈاکٹر اور عاصم میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ عاصم چلا رہا تھا۔ نہیں ڈاکٹر میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ لیکن وہ کسی اور کی ہے میاں، ڈاکٹر نے کہا۔

س سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عاصم بولا۔ آپ نے ہی تو کہا تھا محبت پانے کا نام نہیں اپنا آپ کھو دینے کا نام ہے۔ اچھا میاں ڈاکٹر بولا۔ جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو بہرحال جا رہا ہوں۔ اوہ۔۔۔ ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ میں جاگ رہا ہوں پوچھا۔ میاں کیسی طبعیت ہے اب۔

میں آپ کے ساتھ جاؤں گا ڈاکٹر۔ میں نے جواب دیا۔

کیا تم سفر کر سکو گے میاں۔

ہاں میں نے جواب دیا۔ میں ٹھیک ہوں۔

عین اس وقت کمرے کا دروازہ بجا۔ میں اندر آ سکتی ہوں سر۔ آنسہ کی آواز آئی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔ آپ جا رہے ہیں ڈاکٹر۔ وہ بولی۔

ہاں میں جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا۔

آپ ان کو بھی ساتھ لے جایئے ڈاکٹر۔ آنسہ نے عاصم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ عاصم چلایا۔ میں نہیں جاؤں گا۔

پلیز وہ بولی۔ ان کا روئے سخن ڈاکٹر کی طرف تھا۔

اونہوں، عاصم بولا۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی تو۔۔۔

میری خاطر اس نے منت بھرے انداز میں عاصم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

لیکن کیوں؟ عاصم چلایا۔ کیوں۔

جواب دو آنسے کیا پوچھ رہا ہے یہ۔ ڈاکٹر نے کہا۔

کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور مدھم آواز میں بولی۔ اس لئے کہ ان کے سامنے میں اپنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی۔

اس کے منہ سے ہچکی سی نکلی اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بھاگ گئی۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ڈاکٹر چھت کو گھور رہا تھا۔ عاصم اضطراب میں ٹہل رہا تھا۔ میں اپنی چیزیں سوٹ کیس میں بند کر رہا تھا۔

چلو ڈاکٹر میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ چلو دیر ہو جائے گی۔

ڈاکٹر چونکا۔ ہاں ہاں وہ بولا۔ چلو۔

ٹھہرو ڈاکٹر، عاصم چلایا۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔

جیپ میں ہم سب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر سڑک کو گھور رہا تھا۔ عاصم دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور میرے کانوں میں مرجینا کی آخری چیخ گونج رہی تھی۔

نہ جانے ہم سب کتنی دیر خاموش رہے۔

اکبر ڈاکٹر نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اکبر

جی صاحب، اکبر بولا۔

یہاں کنڈ میں مقامی آبادی نہیں کیا۔

ہے، اکبر نے کہا۔ پر وہ کنڈ میں نہیں رہتے اوپر کنارے میں رہتے ہیں۔

لیکن کیوں؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ہماری پرانی ریت ہے صاحب۔ عورتوں اور بچوں کو کنڈ میں اترنے کی اجازت نہیں۔ مرد دن بھر وہاں دکانداری کرتے ہیں لیکن سورج چھپنے سے پہلے اپنے گاؤں کنارے میں آ جاتے ہیں۔ کنڈ میں رات گزارنا منع ہے۔

کس نے منع کیا ہے؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

پتہ نہیں صاحب بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ کہتے ہیں پہلے کوئی آباد نہ تھا صرف

جھیل میں کنڈ کی دیوی رہتی تھی۔ پھر ایک یوگی آ گیا وہ ایک کھوہ میں دھیان کا آسن مار کر بیٹھ گیا۔ ایک روز کنڈ کی دیوی کھوہ میں چلی گئی۔ اس نے یوگی کا دھیان توڑ دیا۔ یوگی نے سراپ دی۔ بولا جا جو دیوی یہاں پاؤں دھرے گی اس کا بھرم کھل جائے گا۔۔۔ وہ نار بن جائے گی۔ اور اپنی ہی آگ میں جلے گی۔ یوں کنڈ کا نشٹ ہو جائے گا۔

ہوں، ڈاکٹر گنگنایا۔

کنڈ دیوی بھی کرودھ میں آ گئی۔ بولی تو کنڈ کا نشٹ کرنے والا کون ہے۔ اک دن ایسا آئے گا جب کنڈ ساری دھرتی پہ چھا جائے گا۔ ساری دھرتی پر۔ اکبر کھوکھلی ہنسی ہنسنے لگا۔ بڑے بوڑھوں کی باتیں ہیں وہ بولا۔ کون جانے سچ ہیں یا جھوٹ۔

کنڈ ساری دھرتی پہ چھا جائے گا؟ ڈاکٹر گنگنانے لگا۔

ڈاکٹر کے شانے کی اوٹ سے بوڑھے پروفیسر نے سر نکالا۔ اس کے چہرے کی سلوٹوں میں دکھ رینگ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ پراسرار نہ تھی اس میں شیطانیت کی جھلک تھی اور اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے سلے ہوئے ہوں۔ وہ میری طرف گھور رہا تھا۔

جیپ پہلے گیر میں ہونک رہی تھی۔

عاصم بے حس و حرکت بیٹھا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو۔

ڈاکٹر گنگنائے جا رہا تھا۔۔۔ ساری دھرتی پہ چھا جائے گا؟

کٹ پیس باہر اندر

باہر اندر سخت خاموشی نے پنجے گاڑ رکھے ہیں ہر کوئی سمت خاموشی پاؤں پسارے لیٹی ہوئی ہے نہ تو میں بات کرتا ہوں نہ میری ہمدم۔

دونوں کی زبانوں پر سکوت کی مہریں لگ چکی ہیں۔ یا شاید ہمارے کانوں میں بورڈم کا میل جم چکا ہے۔ کوئی بات کرے بھی تو سن نہیں سکتے۔ لیکن نہیں۔۔۔۔ ایسا ہوتا تو اس چھائی ہوئی گہری خاموشی کے تنے ہوئے تمبو سے چیخ کی آواز کیسے سنائی دیتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چیخ سناٹے کی اپنی چیخ ہو۔۔۔ شاید سناٹا خود دم توڑ رہا ہو۔

اف کس قدر سناٹا ہے۔ فریاد سہمی ہوئی بیٹھی ہے دل دھڑک رہے ہیں۔ زین بند میں اس سناٹے نے پھیل کر صحرا کی وسعت اختیار کر لی ہے اس صحرا میں میں خود کو ذرہ محسوس کر رہا ہوں۔

میں چیخنا چاہتا ہوں۔ لیکن خاموشی کی دلدل مجھے نگلے جا رہی ہے۔۔۔ کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہیں میں نے یہ دلدل خود تو نہیں بنائی۔۔۔ کہیں یہ سناٹا میری پناہ گاہ تو نہیں۔۔۔ شاید باہر کی چڑیلوں، آسیبوں کے خوف نے مجھے پناہ گاہ بنانے پر مجبور کر دیا ہو۔

لیکن یہ دھواں، چاروں طرف پھیلا ہوا دھواں اور یہ تاریکی۔۔۔ پتہ نہیں سورج نے اپنی کرنیں کیوں سمٹ لی ہیں۔۔۔ اب دھوئیں کا راج ہے۔ تاریکی ہمیشہ سے عذاب رہی ہے۔ آپ کے لئے میرے لئے۔ ہم سب کے لئے۔ اور میں۔۔۔ میں تو تاریکی کے

عفریت سے بے حد خائف ہوں۔۔۔بے حد۔ایک بے نام خوف چاروں طرف دھواں
بن کر میرے گرد تیرتا رہتا ہے۔دھواں بن کر میرے ہی دل سے اٹھتا ہے اور پھر مسلط و محیط
ہو جاتا ہے۔

لیکن میری ہمدم تو کہاں چلی گئی ہے۔

گھر میں گھور اندھیرا ہے۔۔ہاں ہے۔۔۔صحن میں دھوپ کا گزر نہیں۔۔بالکل
نہیں۔۔۔گلی ویران ہے۔۔۔شہر سنسان ہے۔میں اکیلا ہوں۔۔۔تو نہیں ہے۔

تو کہاں ہے میری ہمدم۔کہاں ،وہاں جہاں درخت ہی درخت ہیں جن کی
شاخوں پر چڑیاں چوں چوں کرتی ہیں۔۔۔درختوں میں سے ایک درخت میرے صحن
میں بھی۔۔۔ایک چڑیا میری انگلی پر بھی بیٹھی ہے وہ بولتی ہے۔۔۔میں سنتا ہوں۔پھر بھی
میں اکیلا ہوں اکیلا۔پھر تو کہاں ہے۔

کہیں یہ صحن میں اُگا ہوا درخت تو ہی تو نہیں۔ہوا آتی ہے درخت پر بیٹھ کر جھولتی
ہے۔تب چڑیاں بولتی ہیں۔پتے تالیاں بجاتے ہیں۔کھڑکیاں کھٹ کھٹ کرتی ہیں۔

لو چڑیا ناچنے لگی۔۔۔اڑ گئی۔ناچتے ناچتے اڑ گئی ارے کہیں تو ہی تو نہ تھی جو چڑیا
بن کر میری انگلی پر بیٹھی تھی۔۔۔تیرا ابھی کچھ پتہ نہیں لگتا۔پہلے اڑ کر آتی تھی۔اب اڑ کر جاتی
ہو کیسے کیسے روپ ہیں تمارے۔بندھن کی وہ راتیں کتنی حسین تھیں جب تمام چاہتیں تمام
پیار تو نے جسم کی ریشمی چادر پر ستاروں کی طرح ٹانک کر مجھ پر بچھا رکھی تھی۔

پر جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تو جسم ہی جسم ہے۔سب جسم ہی جسم تھے عزیز رشتے دار
دوست سب طرف جسم تھے اوپر نیچے ادھر ادھر سامنے پیچھے جسم ہی جسم ہر وقت مجھے گھیرے
رہتے میں ڈر گیا کہیں جسموں میں دفن نہ ہو جاؤں۔بھاگ اٹھا۔بھاگتا ہی چلا گیا۔

دور بہت دور

ملک ملک

شہر شہر

بھاگتا پھرا۔

اس امید پر کہ کہیں تو کوئی نئی چیز ہو گی۔

کوئی نئی بات۔نیا انداز۔نیا رخ۔نیا روپ میں نے نئے زاویے بنائے۔۔۔
پھر مجھے شک پڑنے لگا کہ سب نئے روپ نئے رنگ نئے رخ میری اپنے ہی ذہن کے
ایجاد کردہ ہیں۔

میں پھر بے لگام ہو کر بھاگا۔۔۔ان دیکھی ان جانی منزلوں کی طرف۔۔۔شاید
کچھ نظر آئے۔کوئی سچ کوئی حقیقت جو اٹل ہو۔میرے ذہن کی ایجاد کردہ نہ ہو۔

نئی چیزیں منزلیں۔شیشے میں خوبصورت تعویز کی مانند اتر آتی تھیں۔دور سے
ممکن۔خیرہ کر دیتیں۔قریب جاتا تو وہی اڑتی ریت چلتے بگولے،گھومتی گھنگریاں۔

ایسے لگتا جیسے میرا دل ایک مقبرہ ہو۔بہت ہی خوبصورت بہت ہی دل آویز
مقبرہ۔۔مگر جس مقبرے میں ایک ہی لاش دفن ہو۔میں اس لاش سے بھاگتا
رہا۔۔۔میرے ساتھ لاش بھاگتی رہی۔بھاگتی رہی۔تب میں رک گیا۔میں کیوں بھاگ
رہا ہوں۔کس سے بھاگ رہا ہوں۔

میں کھڑا انتظار کرتا رہا۔۔۔لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا پھر میں تیرے پاس لوٹ
آیا۔

پتہ نہیں انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں تیرے پاس لوٹ آیا ہوں۔انہوں نے
دروازے بند کرنے شروع کر دیئے۔

جب ہم پر سارے دروازے بند ہو گئے تو ناچار ہم نے زمین اوڑھ لی۔گیہوں

اور جو کی بلیاں اٹھائے ہم دریا کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔

یاد ہے تو نے سر پر گھر کی چھت اٹھا رکھی تھی۔ اور جب ہم نے ستانے کے لئے آنکھیں بند کیں تو بے شمار پرندوں نے اپنی لمبی بے رحم چونچوں سے ہماری چھت کو چھلنی کر دیا۔ اور ہم انجیر کے پتوں کے باوجود برہنہ ہوگئے اور پھر۔ پھر وہی جسم۔۔۔

تو سمجھتی تھی تیرے جسم میں ایک انوکھی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ جو میرے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ تو سمجھتی تھی کہ تو اس دنیا کی سورج ہے۔ دنیا تیری وجہ سے گرم ہے روشن ہے۔ تو طلوع ہوجائے تو دن نکل آتا ہے غروب ہوجائے تو اندھیرا ہوجاتا ہے۔

تو سمجھتی تھی کہ تیرے طلائی چہرے اور نقرئی آواز کی زنجیروں سے کوئی نکل نہیں سکتا۔۔۔ اسی لئے تو اپنا طلائی چہرہ سجا کر کھڑکی میں کھڑی ہوجایا کرتی تھی۔

تجھے کچھ بھی تو پتہ نہیں۔۔۔ سن کہ یہاں عورت کا ایک نام ہے ایک رنگ ہے ایک چہرا ہے۔ جس میں کوئی خدوخال نہیں۔ عورت کا کوئی ماضی نہیں کوئی مستقبل نہیں صرف حال ہی حال ہے ایسا حال جو تو نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جب کہ احساس صرف تیرے طالب کو ہے۔ جو آکر عورت کو دیواروں کے پیچھے لے جاتا ہے۔ جہاں چہرے گل ہوجاتے ہیں۔ اور نگاہ کھڑکی سے باہر نکل جاتی ہے۔

بہر حال نہ ختم ہونے والی ویرانی ہے۔ سناٹا ہے خاموشی ہے قدموں بڑھتی آرہی ہے۔ ایک فاقہ زدہ بلا امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے ایک خون آلود چونچ منڈلا رہی ہے۔

اچانک ایک خوفناک پرندہ مجھے گھورنے لگا اسکی لال لال دہکتی آنکھیں میرے بند بند میں چبھ رہی ہیں۔۔۔ دفعتاً اسنے اپنی لمبی نوکیلی چونچ میری شہ رگ میں گاڑ دی۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک جونک چمٹ گئی ہو۔ وہ میرے جسم کا خون چوسے جارہی ہے۔ سرخ

ہوئی جارہی ہے۔ میں پیلا پڑتا جارہا ہوں۔ ہلدی کی طرح زرد۔ چاروں طرف زرد دھند بھرنے لگی۔

یہ زردی کیا چیز ہوتی ہے جو زندگی کے سب رنگوں کو دھوڈالتی ہے۔ جو ہر رنگ پر غالب آجاتی ہے یہ زردی تو جانی بوجھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ زردی تو ہمارے گردوپیش پھیلی ہوئی ہے۔ آندھی بھی زرد ہے۔ سوکھے پتے بھی جو آندھی کی زد میں آکر اڑ رہے ہیں۔

آندھی سے آرہے ہیں۔ یا خوف سے یا شاید۔۔۔ اگر تمہیں بھاگنا ہی ہے تو اکیلے اکیلے کیوں بھاگتے ہو۔ مل کر بھاگو۔

ایک سرگوشی سی ابھرتی ہے نہیں نہیں۔ کسی کو اپنا سفر تنہا طے کرنا ہوتا ہے۔ یہ کون تھا شاید پتے ہوں۔

تو کیا کسی پر سفر لازم ہے۔ میں نے پوچھا۔ ہاں ہاں ہاں۔ کھڑ کھڑ کھڑ۔۔۔ زندگی ایک سفر ہی تو ہے۔

یہ سن کر میں چل پڑتا ہوں۔ ارے یہ بس سٹینڈ ہے کیا۔ یہاں تو کوئی گہما گہمی نہیں۔۔۔ وہی خاموشی وہی سناٹا۔ برگد کا بوڑھا درخت اکیلا کھڑا ہے۔ اسکی چھاؤں میں کوئی سواری نہیں بیٹھی ہوئی۔ نہ کوئی مسافر نہ ڈرائیور، نہ کلینر نہ قلی نہ خوانچے والا نہ فقیر نہ منگتا۔ میں کسی اور جگہ تو نہیں آگیا۔۔۔ سامنے ٹنگا ہوا بورڈ قہقہہ مار کر کہتا ہے بورڈ پر موٹے حروف میں بس سٹینڈ لکھا ہوا ہے۔ حروف میرا منہ چڑھا رہے ہیں۔۔۔ ٹھہرو کہیں یہ ویرانی میرے اندر کی ویرانی تو نہیں کہ ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

وہ سامنے کوئی کھڑا ہے سڑک کے عین بیچ میں اسنے وردی پہنی ہوئی ہے۔ مونچھ لگائی ہوئی ہے کیوں نہ اس سے پوچھوں۔۔۔ میں سڑک کے کونے پر اتر جاتا ہوں۔۔۔

دفعتاً ایک آواز۔۔۔ ایک چیخ۔۔۔ پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

شاید ابھی ابھی میری موت واقعہ ہو چکی ہے۔ میں مر چکا ہوں اسی لئے میز پر آنکھیں بند کیے پڑا ہوا ہوں۔ کچھ لوگ میرے سرہانے کھڑے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں ہاں مجھے تو سنائی دیتا ہے۔ نہیں میں مرا نہیں ہوں۔ ارے میری آنکھیں تو چوپٹ کھلی ہیں۔ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے انہیں بند کر لیا تھا۔ پھر یہ آپ ہی آپ کیسے کھل گئیں۔ عجب بیماری ہے یہ کہ اپنی بینائی پر قابو نہیں رہا۔

ہاں مجھے تو نظر آ رہا ہے میں دیکھ رہا ہوں۔ میرے پہلو میں چار آدمی کھڑے ہیں۔ انہوں نے لمبے لمبے سفید کپڑے پہن رکھے ہیں۔ وہ آپس میں مشورہ کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے اشارہ کر کے کسی کو بلایا ہاں یہ کہاں سے آ گئی۔ میری ہمدم۔۔۔ یہ کون سی جگہ ہے میں یہاں کیوں لیٹا ہوا ہوں۔

وہ کچھ کہہ رہے ہیں ایک سرگوشی۔ چھپانے کے لئے۔ ہاں میں کو نے تلاش کر رہی تھی۔ بی بی مریض کا اندر باہر آ کر پھیل گیا ہے۔ کون مریض؟ کس کا اندر؟ مجھے غصہ آ جاتا ہے۔

میں اپنی ہمدم کو بلاتا ہوں۔

وہ آ کر مجھ پر جھک جاتی ہے۔

یہ لوگ پاگل ہیں، میں کہتا ہوں۔ اگر اندر باہر آ گیا ہے تو باہر کو کیا ہوا۔

حیرت سے اسکی آنکھیں خانوں سے باہر نکل آتی ہیں۔ اور وہ پوچھتی ہے کون سا باہر۔ سفید چغے پہنے ہوئے چاروں آدمی گھبرا کر اس کی طرف دیکھتے ہیں اور اپنے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیتے ہیں۔

تیس ہزار

تیس ہزار! اکبر کا لیجہ دھک سے رہ گیا جسم میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ جسم میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ اس کی نگاہ میں اردگرد کی عمارتیں دھندلی پڑ گئیں۔ سامنے مسجد کا گنبد ٹوٹ کر آسمان کی طرف اچھلا، برامدے کے ستون ایک دوسرے سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑے۔ تیس ہزار۔۔۔

پھر اُسے کچھ یاد نہیں۔

نجانے کُل پرزوں کا وہ سوداگر جسے وہ ساتھ لایا تھا کیا کہہ رہا تھا۔ اُسے یہ بھی تو یاد نہیں کہ اُس نے سودے کو پکا کرنے کیلئے سوداگر سے کیا کہا تھا۔ جب وہ واپس گھر آ رہا تھا اُس روز اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سا منظر پھیلا ہوا تھا۔

بتیاں کبھی مدھم پڑ جاتیں اور کبھی لپک کر جلنے لگتیں۔ موٹریں اندھا دھند چلی آ رہی تھیں۔ لوگ دیوانہ وار بھاگ رہے تھے۔ تانگے گویا ہوا میں تیر رہے۔ تیس ہزار۔۔۔ اکبر علی کے دل میں دھنکی بج رہی تھی۔ گویا چوک میں وہ رک گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ تھک گیا ہے۔ جسم کا بند بند ربڑ کی گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔ نس نس میں تھرتھری سی ہو رہی تھی۔ رک کر اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

دفعتاً وہ روشنی اور اندھیرے کا عجیب و غریب دھندلکا صاف ہو گیا۔ بتیاں استادہ ہو کر جلنے لگیں۔ موٹریں ہرنیوں کی کلانچیں بھرنے لگیں اور لوگ تفریحی انداز میں چلتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

اس وقت اکبر علی نے محسوس کیا کہ وہ معمول سے زیادہ قد آور ہے اور اُس کی چھاتی بہت چوڑی ہے۔ یہ احساس اُس کیلئے قطعی طور پر نیا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو منحنی اور نحیف محسوس کیا کرتا تھا اور لوگوں کے اندازِ خرام کو دیکھ کر پٹڑی پر اور بھی

سہم اور سمت جایا کرتا تھا۔ تیس ہزار۔۔ اُس کے شانے اور بھی پھیل گئے۔ راہگیر اُسے دیکھ کر جھینپنے لگے اور اُس کا راستہ چھوڑ کر پٹری کے ایک طرف ہٹ گئے۔ نجانے اُس روز اُس نے اپنے گھر کا دروازہ کس انداز سے کھٹکھٹایا۔ کہ بیگم سمجھے کہ مالک مکان کرایہ لینے کے لئے آیا ہے۔ ننھا دوڑا دوڑا امی کے پاس آیا۔ ''امی باہر کوئی ہے۔''

''چپ'' ماں نے تیوری چڑھائی۔ گھر پر خاموشی چھا گئی۔ رضیہ نے سنا تو چپکے سے کشیدہ اٹھا کر کاڑھنے لگی۔ ورنہ عام طور پر وہ سب ابا کی دستک کو فوراً پہچان جایا کرتے تھے۔

''اے جی رضیہ سنا نہیں تو نے باہر تیرے ابا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور تو یوں چپ بیٹھی ہے''۔ یا رضیہ بول اٹھتی ''اصغر باہر کب سے ابا جان دوروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔'' پر اُس روز وہ سب خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اصغر چیخنے لگا۔ ''ابا گھر پر نہیں ہیں جی۔'' اور باہر سے آواز آئی ''اصغر میں ہوں۔''

اس روز پہلی مرتبہ اندر داخل ہونے کیلئے اُسے جھانکنا پڑا۔ اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیگم کے پاس جا پہنچا۔

''ہائیں آپ تھے۔'' وہ حیران رہ گئی۔ اور پھر چپکے سے بولی ''کیا ہوا؟'' اور اکبر علی نے اُس کے کان کے قریب ہو کر کہا ''رضیہ کی ماں تیس تیس''۔ وہ بات اکبر علی کے گلے میں پھنس گئی اور وہ گھبرا کر پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ ''بیگم تیس ہزار۔''

''تیس ہزار؟''

بیگم کے ہاتھ سے دال بھرا چمچہ زمین پر گر گیا۔ ''ہاں''۔ اکبر نے کہنے کی کوشش کی لیکن اُس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ ''ہاں۔'' وہ بصد مشکل بولا۔ ''تی ی ای س'' اور پھر دھم سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

وہ دن اکبر علی کیلئے ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی تمام زندگی رکے ہوئے پانی کے مصداق تھی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ اس میں تعفن کی بو نہ تھی۔ ایک زمانے

سے وہ دفتر میں سٹور کیپر کا کام کر رہا تھا اب تو اُسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ کب دفتر میں ملازم ہوا تھا۔ دفتر کی ملازمت سے پہلے کی زندگی کے متعلق اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ یاد بھی کیسے ہوتا کیونکہ سترہ سال کی عمر میں وہ ملازمت تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ والد کی وفات پر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور مجبوراً بوڑھی والدہ اور بیوی کے بسر اوقات کرنے کیلئے اُسے نوکری کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ اتفاق میں اُس دفتر میں دفتری کی جگہ خالی تھی۔ اور صاحب نے آزمائشی طور پر اُسے دفتر میں رکھ لیا۔ سال میں اُس نے دفتری کا کام کیا۔ اُس دوران اکبر علی نے دفتر کی مشین پر ٹائپ کا کام سیکھ لیا اور وہ کلرک بن گیا۔ اور پھر ریکارڈ کے کام میں مہارت حاصل کرنے کے بعد صاحب نے اُسے سٹور کیپر کی جگہ دلا دی۔

میٹریکولیٹ نہ ہونے کی وجہ سے اب اُس کیلئے مزید ترقی ممکن نہ تھی لیکن اُس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ اُسے کبھی اس بات کا خیال بھی نہ آیا تھا کہ اُس کیلئے ترقی کا راستہ مسدود ہے۔ اور کبھی خیال آتا بھی تو وہ اُسے درخور اعتنا نہ سمجھتا۔ کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے وہ اپنے حق سے زیادہ روپیہ کما رہا ہے۔

ملازمت کی ابتدا میں اُس نے کئی بار شدت سے خواہش محسوس کی تھی کہ وہ دسویں پاس کر لے۔ لیکن یہ خواہش محض خواہش ہی رہی تھی۔ کیونکہ اُسے عملی جامہ پہنانا اُس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اُس کے گھر میں بیوی آ چکی تھی۔ یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب وہ آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اور بیوی کے مفہوم سے قطعی ناواقف تھا۔

والدین نے بڑے چاؤ سے اُس کا بیاہ رچایا تھا۔ اور وہ خود خوشی خوشی رنگ دار کپڑے پہن کر گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔ اُن دنوں اُس کے نزدیک شادی ایک دلچسپ تفریح تھی۔ ایسی تفریح جس میں کپڑے پہننے، گھوڑے پر چڑھنے کے علاوہ ڈھولک بجانے، چاول بانٹنے اور سلام کرنے پر روپیہ حاصل کرنے کی دلچسپ رسومات شامل تھیں۔

شادی کے بہت دیر بعد اُس پر انکشاف ہوا کہ بیوی کیا ہوتی ہے۔ اس کے

باوجود بیوی سے متعلقہ ذمہ داریوں کا احساس اُسے قطعی نہ ہوا۔ وہ تو اُس وقت ہوا جب اُس کے والد فوت ہو گئے اور اُسے سکول کو چھوڑ کر دفتری کا کام کرنا پڑا۔ اس کے باوجود یہ بات اُس پر واضع نہ ہوئی تھی۔ اکبر علی اپنی زندگی سے قطعی طور پر مطمئن تھا۔ مانا کہ گھر کے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ لیکن اخراجات کے قضیئے کا تو اُس سے تعلق نہ تھا۔ پہلی تاریخ کو وہ تنخواہ لاکر رضیہ کی ماں کے حوالے کر دیتا۔ اور پھر اطمینان سے حقہ پینے میں لگ جاتا جیسے وہ اُن کے حقِ خدمت پورے طور پر ادا کر چکا ہو۔ رضیہ کی ماں خرچ کی کمی پر بسورتی رہتی۔

''لو میں ایک سو تیس روپے کو کیا کروں''۔ دس روپے خان کی ماں کے دینے ہیں، پانچ قصائی کے سر پر ہیں۔ بیس روپے چچی سے لیے تھے۔ چھ ماں سے چچی کہہ رہی ہیں مگر کچھ بچے تو اُسے دوں۔ اللہ رکھے گھر میں چھ بچے ہیں۔

رضیہ کے بدن پر ایک قمیض بھی نہیں۔ میں کیا کروں، ہائے میرے رضیہ تو اب جوان ہو چکی ہے۔ اس کی بھی فکر ہے کچھ؟ میں تو اس فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔''

اکبر علی یہ سب سن کر ان سنی کر دیتا۔ لیکن جب رضیہ کی شادی کی بات شروع ہو جاتی تو اُس کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن تھا اور چوری چوری دل ہی دل میں سمجھتا تھا کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اللہ کارساز ہے۔ اگر چہ اُس نے اُس بات پر شعوری طور پر کبھی نہ سوچا تھا اور شاید اسی چھپی ہوئی امید کی وجہ سے وہ اسقدر مطمئن تھا اور اُس نے کبھی ناجائز ذرائع سے آمدنی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ حالانکہ سٹور کیپری میں وہ بڑی آسانی سے زائد آمدنی کی صورت پیدا کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُسے کبھی یہ بات سوجھی ہی نہ تھی کہ سٹور سے چیزیں خرد برد کی جا سکتی ہیں۔ وہ بیچی جا سکتی ہیں۔ ان کے سٹور میں تھیں بھی تو عجیب وغریب چیزیں۔ قسم قسم کی مشینیں، اوزار، آلہ جات اور نہایت قیمتی کل پرزے۔ سٹور سے وہ صرف پنسلیں لایا کرتا تھا۔ کسی نہ کسی طریقے سے وہ پنسلیں بچا لیتا اور پھر بچوں کیلئے وہ پنسلوں کے دو ایک پیکٹ اٹھا لاتا۔ اور انہیں بچوں میں تقسیم کر دیتا۔ بانٹنے

سے پہلے وہ پنسلوں پر سرکاری نشان کو چھیل دیا کرتا تھا تا کہ کوئی اعتراض نہ کرے۔ جب وہ پنسلیں لاتا گھر میں دھوم مچ جاتی۔ سب بچے اُس کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ میں تو دو لوں گا، اصغر شور مچاتا۔ پنچھل پنچھل، ننھا چیختا۔ میں نہیں لیتی۔ رضیہ خاموشی سے کہتی مجھے چھ چاہیں۔

رضیہ کو سب سے زیادہ پنسلوں کی ضرورت تھی۔ وہ نویں میں پڑھتی تھی نا اس لئے اور شوقیہ طور پر ڈرائینگ بھی کیا کرتی تھی نجانے کیوں اُسے دفتر کے ماحول سے ڈر سا محسوس ہوتا تھا۔ شاید اس لئے کہ دفتر کے تمام بابو اور صاحب ہندو تھے۔ اُنہیں آپس میں کانا پھونسی کرتے دیکھ کر خامخواہ اس کا ماتھا ٹھنکتا۔ بات کرنا چاہتا تو گویا کچھ حلق میں پھنس جاتا۔ ''پاکستان'' اس کے دل میں کئی بار مدھم سی آواز آتی اور وہ مسکرا دیتا۔ اس کے خیال میں پاکستان محض ایک خواب تھا، محض ایک خواب۔۔۔ پھر اس روز جب اُس نے سنا کہ سٹور کے پچھواڑے میں بم پھٹا ہے۔ وہ بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔ سٹور کی ایک دیوار گر گئی تھی۔ چیزیں بکھری دیکھ کر نہ جانے اُسے کیا ہوا۔ دفعتاً اُس نے محسوس کیا کہ وہ سب دولت پاکستان کی تھی جسے ہندوستان کے بم تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

''پاکستان زندہ باد'' کسی نے دور سے نعرہ لگایا۔ اس پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ ایک جوش سے بڑھ کر اُس نے تمام قیمتی سامان خالی بوریوں میں ڈال دیا۔ لیکن اس سامان کو محفوظ کیسے کرے۔ پریشانی میں سوچتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ بائیں ہاتھ پر موٹر گیراج دیکھ کر دفعتاً اس کی آنکھیں چمکیں۔ گیراج میں کوئی موٹر نہ تھی۔ بلکہ اس کی جگہ ردی کاغذوں کے انبار لگے تھے۔ وہ سارا سال ردی اس گیراج میں جمع کرتے رہتے تھے اور پھر ردی کو بوریوں میں بند کر کے اُسے بیچ دیا کرتے۔

دفتر لگنے میں ابھی کم از کم دو گھنٹے تھے۔ یہ محسوس کر کے اس نے باری باری بوریوں کو اُٹھا کر گیراج میں جا پھینکا اور ہر بوری کو کھول کو اس میں خالی جگہ ردی بھر دی تا کہ دیکھنے میں وہ بوریاں ردی سے بھری دکھائی دیں۔ اور پھر ان کو ردی کے انبار تلے چھپا دیا۔ یہ کام ختم کر کے اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ایسے محسوس کیا جیسے وہ ہمیشہ کیلئے مملکت

پاکستان کا تحفظ کر چکا ہو۔ جیسے اُس نے دولتِ پاکستان کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا ہو۔ اُس روز وہ کس قدر خوش تھا۔ اس کے بعد جب بھی وہ پاکستان کا سن پاتا تو اُسے وہ چھپی ہوئی بوریاں یاد آجاتیں اور وہ محسوس کرتا، جیسے پاکستان کی تعمیر میں اُس کا بھی حصہ ہو۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ چھپی ہوئی بوریاں اُسے قطعی طور پر بھول گئیں اور اُس کی توجہ دوسرے امور کی طرف مبذول ہوگئی۔

ہندوؤں کے جانے کے بعد دفتر کی کایا ہی پلٹ گئی۔ نئے افسر مقرر ہوئے، نئے بابو رکھے گئے حتیٰ کہ چپراسی بھی نئے آ گئے۔ اب صرف اکبر علی ہی ایک آدمی تھا جو دفتر کے پرانے حالات سے واقف تھا۔ پاکستان اب خواب نہ تھا بلکہ ایک ٹھوس حقیقت بن چکا تھا۔ اب بابو لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے اُسے جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہیڈ کلرک سے مل کر اُسے ایسا محسوس نہ ہوتا جیسے وہ اُسے دفتر سے نکالنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ اس نئی فضا میں وہ اس قدر خوش ہوا کہ اُسے وہ چھپی ہوئی بوریاں یاد ہی نہ رہیں۔ وہ بوریاں اُسے یاد ہی نہ آتیں اگر اُس روز سپرینٹنڈنٹ ردی کے گیراج کا معائنہ کرنے نہ آتے۔

''ہوں تو یہ سب ردی ہے،'' انہوں نے قریب کی بوری کو ٹھوکر مار کر کہا۔

''جی جی۔۔'' اکبر علی نے کچھ کہنا چاہا۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے''۔ وہ بولے ''اسے ڈسپوز آف کر دو۔''

''لیکن لیکن''۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ''لیکن ویکن کچھ نہیں''۔ وہ بولے ''ٹینڈر لے کر سب کباڑ خانہ بیچ دو''۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

رات کو اکبر علی نے جب وہ واقعہ بیوی کو سنایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''اے ہے وہ جوش میں بولی خدا کی سنوار ان پاکستان والوں کی، اتنے ہی بے پرواہ ہیں تو کیا وہ کل پرزے ہمارے کام نہیں آسکتے؟ میں کہتی ہوں کچھ اپنا خیال بھی ہے۔ اللہ رکھے لڑکی جوان ہے اور یہاں تو اللہ کا نام ہے۔ ایک جوڑا نہیں جو اُسے دے سکیں۔ سارا گھر بار تو امرتسر میں چھوڑ آئے۔ پاکستان پر ہمارا حق نہیں کیا؟ ہمیں چار پیسے مل جائیں گے تو کیا پاکستان کنگال

ہو جائے گا۔''

بیوی کی باتیں سن کر اکبر علی بھی سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن وہ شاید ایسی کوئی بات نہ کرتا اگر بیگم پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے نہ پڑ جاتی۔ اس کے بعد جب وہ دونوں اکٹھے بیٹھتے تو مل کر حساب کرتے رہتے۔ ''اتنے روپے جہیز پر لگیں گے۔'' وہ کہتی ''مہمانوں کے بیٹھنے کیلئے صوفہ بھی تو چاہیے''۔ اکبر علی حقے کا کش لگا کر کہتا بس تمہیں تو صوفہ سیٹ کی پڑی رہتی ہے۔ لڑکی کا سامان پورا ہو جائے گا تو دیکھا جائے گا۔ ''ریڈیو بھی آ جائے تو کتنا اچھا ہو''۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہہ جاتا۔ ''لو یہاں تو ریڈیو کی پڑی ہے!''۔ وہ ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتی۔

اُن کا خیال تھا کہ وہ سامان زیادہ سے زیادہ ایک دو ہزار میں بک جائے گا اور وہ اس رقم سے لڑکی کا بیاہ کر دیں گے۔ لیکن تیس ہزار!!

تیس ہزار!! بیگم نے حیرانی سے ہونٹ پر انگلی رکھ لی۔ اکبر علی پنسلوں کے نئے پیکٹ کو گھورنے لگا جو وہ بچوں کو بانٹنے کیلئے سٹور سے لایا تھا۔ ''چھ سو روپے میں تو اچھا ریڈیو سیٹ آئے گا۔'' ''آگ لگے تمہارے راڈیو کو''۔ وہ بولی ''میں تو ایسی چیز کیلئے ایک پیسہ نہ دوں گی۔'' اور وہ حسبِ معمول اُس سے جھگڑنے لگی اور اکبر علی صوفہ سیٹ، ریڈیو اور ریسٹ واچ کے خواب دیکھنے لگا۔ اصغر نے آ کر اُن دونوں کو چونکا دیا کہنے لگا ''ابا جی آپ نے تو کہا تھا کہ پنسلیں لائیں گے''۔ اصغر کی بات سن کر وہ پھر حقائق کی دنیا میں آ گئے۔ بیگم کے سامنے جہیز کا چنا ہوا سامان گم ہو گیا۔ اکبر علی کا صوفہ سیٹ ٹوٹی ہوئی چارپائی میں تبدیل ہو گیا۔ اور بش ریڈیو دور ہٹ کر کسی پڑوسی کے مکان سے اُن کا منہ چڑھانے لگا۔

''کہا نہیں تھا آپ نے''۔ اصغر نے اپنی بات دھرائی۔

''اوہ''۔ اکبر چونکا۔ ''ہاں ہاں لیکن''۔ وہ پنسلوں کے پیکٹ کو دیکھے بغیر گھمانے لگا۔

''یہ کیا پنسلیں نہیں؟'' بیگم پیکٹ کو دیکھ کر بولی۔ ''اوہ، اکبر علی چونکا۔ ''ہاں ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ یہ لو بیٹے یہ تمہاری، یہ رشید کی، یہ دو ثریا کی، اور یہ چھ رضیہ کو دے

دو۔'' اُس نے اُسے پنسلیں دیتے ہوئے کہا۔'' اور ان پر جو یہ سرکاری نشان ہیں اسے چھیل دینا۔ سمجھے''!

''اور ننھے کی؟'' اصغر نے پوچھا۔

''ننھے کی''۔ اُس نے حیرانی سے دھرایا۔

''وہ میری پنسل لے کر اُسے توڑ دیا کرتا ہے میرے پاس رہنے ہی نہیں دیتا کوئی پنسل۔''

''اچھا''۔ وہ ہنسا۔''تو رضیہ کو پانچ دے دینا اور ایک ننھے کو۔''

اصغر کے جانے کے بعد بیگم بولی۔''تو کل سودا طے کر لینا کہیں سوداگر بدل نہ جائے۔''

''میں نے سب طے کر لیا ہے''۔ وہ بولا۔

''لیکن یہ بات پرسوں پر نہ رکھنا، ہاں۔''

''نہیں نہیں''۔ وہ بولا'' آدھا روپیہ کل مل جائے گا''۔

''کل!'' وہ چلائی۔ اور وہ دونوں پھر خرید و فروخت کے منصوبے باندھنے لگے۔ ساری رات انہیں نیند نہ آئی صبح سویرے اکبر علی تیار ہو گیا۔ جب وہ جانے لگا تو بیگم بولی۔''روپیہ سنبھال کر لانا''۔ سو کے نوٹ ہوں اور جیب میں نہ رکھنا، لوگ شک کریں گے یہ لو رومال۔'' اُس نے رومال دیتے ہوئے کہا۔''اس میں لپیٹ کر کمر سے باندھ لینا۔''

اکبر علی نے رومال لے لیا اور چل پڑا۔ ابھی وہ ڈیوڑھی میں ہی میں تھا کہ ننھا بھاگا بھاگا آیا۔''ابا جی ابا'' وہ چلایا'' یہ لو اپنی پنچھل۔ میں نہیں لیتا یہ۔''

وہ رک گیا اور مسکرا کر کہنے لگا کیوں نہیں لیتے تم یہ پنسل۔

''پھل آپی مجھے چول کیوں کہتی ہیں''۔ وہ بسورنے لگا۔

''میں کیا چول ہوں۔ بتاؤ۔''

''نہیں تو۔'' اکبر علی ہنسنے لگا۔

''پھل پوچھو آپی چھ''۔ وہ اُسے گھسیٹنے لگا۔ وہ چلایا۔'' آپی کہتی ہے یہ پنچھل پاکستان کی ہے، ہمالی نہیں''۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

''کیوں رضیہ''۔ اُس نے پوچھا۔''تم ننھے کو چور سمجھتی ہو کیا؟''

''چور تو ہے''۔ وہ بولی۔

''کیوں''۔ اُس نے پوچھا۔''یہ تو سرکاری پنسل ہے، چوری کی تو نہیں۔''

''سرکاری کہاں ہے''۔ رضیہ نے جواب دیا۔''اُس پر تو پاکستان گورنمنٹ لکھا ہے۔ میں تو کبھی اس پنسل سے کام نہ کروں۔'' وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

''لیکن پہلے تو تم سرکاری پنسل سے ہی لکھا کرتی تھیں۔'' اُس نے ہنس کر پوچھا۔

''جب اور بات تھی''۔ وہ بولی۔''ان دنوں تو سرکار کو نقصان ہوتا تھا۔ لیکن اب تو ہمارا اپنا نقصان ہے۔ پاکستان کا نقصان ہے۔''

''اپنا نقصان؟'' وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں ہاں''۔ وہ بولی'' آخر پاکستان کی حکومت اس پر پیسے خرچ کرتی ہے۔ مفت میں نہیں آ جاتی ہیں یہ پنسلیں۔'' وہ چلائی۔'' میں تو پھر کبھی اس کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گی۔ یہ میرے لئے نہ لایا کریں آپ دفتر سے پنسلیں۔ میں اپنے جیب خرچ سے خرید لیا کروں گی۔ یہ تو سراسر چوری۔''

''ابا چول، ابا چول۔'' اصغر چیخنے لگا۔

اکبر علی کو پسینہ آ گیا۔ اور وہ چپ چاپ باہر سڑک پر نکل گیا۔

چول۔۔ چول۔ ریڈیو اُس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ چور، چور، چور، چور چکی سر پیٹ رہی تھی۔ اور وہ بھاگ رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔ دفعتاً وہ رک گیا۔ دفتر کے بجائے وہ صاحب کی کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے دیوانہ وار کوٹھی کی طرف دیکھا اور پھر جست لگا کر گھنٹی کے بٹن کے پاس پہنچ گیا اور اُسے یوں دبانے لگا جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لے رہا ہو۔ پھر وہ

بھاگ کر کوٹھی کے میدان میں داخل ہو گیا۔ جیسے ڈرتا ہو کہ کہیں واپس نہ لوٹ جائے۔ اُس کے پیچھے بیگم بھاگتی بھاگتی آ رہی تھیں۔ ''لوٹ آؤ، لوٹ آ۔ روپیہ کمر سے باندھ لینا۔ جیب میں نہ رکھنا۔ سو سو کے نوٹ ہوں۔'' وہ دیوانہ وار اندر گھس گیا کہ کہیں بیگم اُسے پکڑ نہ لے۔

سامنے رضیہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ چول چول۔'' ننھا تالیاں بجا رہا تھا۔

''صاحب صاحب''۔ وہ چلایا۔ وہ بوریاں مشین اور کل پرزے، تیس ہزار''۔

صاحب حیرانی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔'' بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔'' انہوں نے اکبر علی سے کہا۔

''یہ بوریاں پاکستان کا مال ہیں۔ ہمارا مال نہیں۔''

وہ دھڑام سے کرسی پر گر پڑا۔

اک کسوٹی ہے ترے کردار کی
مرتبہ کیا۔ مال کیا۔ اولاد کیا۔

گڈی کی کہانی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ محض اتفاق سے گڈی اور میری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم پکے دوست بن گئے تھے۔ ہم نے اپنی چیچیاں کنڈل بنا کر ملائی تھیں اور پکی دوستی کی قسم کھائی تھی۔ ہماری دوستی کی وجہ ایک نقش تھا۔ یہ نقش بے حد خوبصورت تھا۔ چار مربع انچ کا کارڈ چمکدار گہرے نیلے رنگ کے عین درمیان میں روپہلی روشنائی میں ''اللہ'' لکھا ہوا تھا۔ گڈی اس نقش کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ چونکہ اسے اللہ سے بے اندازہ محبت تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے کارڈ اسے دیدیا تھا اور یوں ہماری دوستی پکی ہو گئی تھی۔

اس دن سے گڈی اس نقش کو سینے سے لگا کر رکھتی۔ ہر وقت ہر جگہ اسے جیب میں ڈالے پھرتی۔ کہتی تھی یہ میری گڈ لک ہے۔ اگر کسی وقت وہ نقش پاس نہ ہوتا تو سخت گھبرا جاتی چہرہ زرد ہو جاتا، آواز رونی ہو جاتی اور وہ دیوانہ وار گھر کی طرف اٹھ بھاگتی۔ جب تک اُسے نقش نہ مل جاتا اس کی حالت ٹھیک نہ ہوتی۔ اگر امتحان میں اسے اچھے نمبر ملتے تو سمجھتی یہ صرف نقش کی برکت کی وجہ سے، اگر بیمار پڑ جاتی تو ''اللہ'' کو اپنی جیب سے نکال کر کہتی، اللہ میاں مجھے اچھا کر دے۔ اگر گرتے گرتے بچ جاتی تو کہتی لو میں کیسے گر سکتی ہوں بھلا میرے پاس اللہ جو ہے۔ وہ نقش گڈی کے لئے فیٹش بن گیا تھا۔

گڈی سے میری ملاقات کیسے ہوئی۔ ہاسٹل میں میرا روم میٹ حبیب تھا۔ حبیب پپلاں والی کا رہنے والا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی شادی پر وہ مجھے ساتھ گاؤں لے گیا۔ جب حبیب اور میں بس میں گاؤں جا رہے تھے تو ایک سٹاپ پر ایک آدمی میرے پاس آیا۔ اس

کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ تھیلے میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ غالباً وہ کتب فروش تھا۔

میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ میرے پاس بڑی خوبصورت حمائل شریف ہے۔ دکھاؤں۔

معافی چاہتا ہوں۔ میں نے معذرت کی۔

دیکھیں تو سہی۔ وہ بولا، چاہے نہ خریدیں

سوری میرے پاس وقت نہیں ہے۔

اچھا، وہ بولا۔ آپ کی مرضی میری طرف سے یہ تحفہ قبول فرمائیں۔ اس نے ایک کارڈ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے دیکھے بغیر اسے جیب میں ڈال لیا۔ اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

پپلاں والی پہنچ کر جب میں نے اس کارڈ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اتنا خوبصورت نقش میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی میں کارڈ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی معصوم سی لڑکی اندر آ گئی۔

بولی، آپ دلہن کے بھائی ہیں۔

نہیں تو، میں نے کہا۔ میں تو باراتی ہوں۔

باراتی کون ہوتا ہے؟

باراتی وہ ہوتا ہے جو بارات کے ساتھ جائے۔ تم کون ہو؟ میں نے پوچھا۔

میں گڈی ہوں۔ وہ بولی۔ ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں۔

پڑھتی ہو؟

ہاں پڑھتی ہوں۔ میرے ابو سر ہیں۔

وہ کیا ہوا سر؟ میں نے پوچھا۔

سر نہیں جانتے۔ وہ حیرت سے کہنے لگی۔ سر وہ ہوتا ہے جو بچوں کو پڑھائے۔

اچھا تو تمہارے ابا ماسٹر ہیں۔

ہاں، وہ بولی۔ جبھی ہم ان کو سر کہتے ہیں۔ آپ بھی تو پڑھتے ہیں نا۔

ہاں، میں نے کہا۔

کون سی جماعت میں؟

میں نے بارہویں کا امتحان دیا ہے۔

پاس ہو جائیں گے نا۔

ضرور ہوں گا، کیوں نہیں ہوں گا۔ میں نے چھاتی نکال کر کہا۔

نہ نہ نہ نہ، وہ بولی۔ ایسے نہیں کہا کرتے۔

تو کیسے کہا کرتے ہیں۔

کہیئے انشاءاللہ۔

اللہ کو تم جانتی ہو کیا۔

ہاں، وہ بولی۔ اللہ میاں بڑے ہی پیارے ہیں۔

اس پر میں نے وہ نقش اٹھا کر گڈی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور جب میں نے کہا۔ یہ تم لے لو تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

پھر ہم بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہم نے چچیاں لڑائیں، پکی دوستی کی قسمیں کھائیں اور ہم یوں گھل مل گئے جیسے سالہا سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

میں نے اسے کہا گڈی تم مجھے غفو کہہ کر بلایا کرو۔ میرے سارے دوست مجھے غفو کہتے ہیں۔

گڈی کو اس نقش سے اتنا گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اس کی تفصیلات مجھے حبیب نے بتائیں تھیں جو اکثر گاؤں جاتا رہتا تھا۔

ایک سال بعد جب کالج چار دن کے لئے بند ہوا تو حبیب کہنے لگا چلو یار اب کی چھٹیاں گاؤں میں منائیں۔ میں حبیب کی بات مان گیا اور ہم پپلاں والی جا پہنچے۔

اس وقت شام پڑ چکی تھی۔ میں نے حبیب سے کہا۔ یار میں اپنی دوست سے مل آؤں۔ کہنے لگا اسے یہیں بلا لیتے ہیں۔

نہیں، میں نے کہا۔ میں خود چل کر اس کے گھر جاؤں گا۔

دراصل میں گڈی کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

جب میں گڈی کے گھر کے بیرونی صحن میں پہنچا تو اندھیرا ہو رہا تھا۔ بیٹھک میں بتیاں جل رہی تھیں۔ دروازے پر بہت سے جوتے پڑے ہوئے تھے۔ معلوم پڑتا تھا کہ اندر بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اندر سے اللہ اللہ اور سبحان اللہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا گڈی بیٹھک میں نہیں بلکہ اندر ہو گی۔ میں گھر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ جو بیٹھک سے کافی ہٹ کر تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں دروازہ بجاؤں گا تو کوئی نہ کوئی آئے گا اور وہ گڈی کو بلا دے گا۔ جب میں دروازے کے قریب گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلیز کے پاس گڈی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ چپ چاپ اُداس گڈی۔ میں نے اسے بلایا اس پر وہ چونکی۔ اس نے مجھے دیکھا تو اچھل کر مجھ سے لپٹ گئی۔

پھر ہم دونوں وہیں پتھر پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا گڈی تم اتنی بدل کیوں گئی ہو۔ اس نے ایک آہ بھری، بولی غفو سب کچھ بدل گیا ہے، سب کچھ، گھر گھر نہیں رہا، ابو وہ ابو نہیں رہے۔ اور امی کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے یہ سب لوگ بدل کیوں گئے ہیں غفو، اس نے مجھ سے پوچھا۔

پتہ نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

ارشی بھی یہی کہتا ہے۔ ارشی میرا بھائی ہے نا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ میں

نے کہا ارشی یہ سب لوگ بدل کیوں گئے ہیں۔ کہنے لگا مجھے کیا پتہ۔ گھر میں کوئی اور ہو تو اس سے پوچھتی۔ گھر میں ابو ہیں، امی ہیں، ارشی ہے اور چاچا ہیں۔ پہلے میں سب باتیں ابو سے پوچھا کرتی تھی۔ ابو ایسا کیوں ہے۔ ابو ویسا کیوں ہے۔ ایک دم ابو سے کئی سوال پوچھا کرتی تھی۔ اور ابو نے کبھی برا نہ مانا تھا وہ ہنس پڑتے اور پھر پیار سے مجھے گود میں اٹھا لیتے اور پھر مجھے ساری باتیں سمجھاتے۔ باتیں تو سمجھ میں نہیں آتی تھیں پر وہ مجھے اتنے پیار سے سمجھاتے تھے مجھے لگتا تھا جیسے سب سمجھ گئی ہوں۔

شاید اسی لئے تم ابو سے پوچھا کرتی تھیں۔ میں نے کہا۔

ہاں، وہ بولی۔ پر اب ابو مجھ سے بات ہی نہیں کرتے۔ انہیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ میرے پاس بیٹھیں۔ میری بات سنیں اور امی۔ امی تو بس گھورتی ہی رہتی ہیں۔ پھر میں نے ارشی کے دوست رفی سے پوچھا تھا۔ میں نے کہا رفی یہ سب کچھ بدل کیوں گیا ہے۔ رفی بولا۔ تمہارے اللہ میاں جو آ گئے ہیں۔

کیا واقعی میں نے کہا۔ تمہارے گھر اللہ میاں آ گئے ہیں۔

عین اس وقت بیٹھک سے اللہ اللہ کا شور اٹھا۔

وہ وہ، گڈی بولی سن لیا نا غفو۔ ہمارا تو سارا گھر اللہ میاں سے بھر گیا ہے۔ ہماری جو بیٹھک ہے نا اس میں اللہ میاں آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہماری بیٹھک میں ایک نیم چھتی ہے اس پر ایک تخت پوش بچھا ہوا ہے۔ اللہ میاں اس تخت پوش پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے سر پر ایک تاج ہے۔ ہاتھ میں ایک کھونڈ ہے اور ان کے کپڑے سنہری ہیں اور ماتھے پر رعب ہی رعب ہے۔

سچ میں نے گڈی سے پوچھا۔ تم نے انہیں دیکھا ہے۔

نہیں وہ بولی، وہ دکھتے نہیں پر ایسا لگتا ہے جیسے بیٹھے ہوئے ہوں۔ بچی۔ صرف

مجھے ہی تو نہیں لگتا۔ سب کو لگتا ہے، سارے گاؤں والوں کو۔ اسی لئے تو سارے گاؤں والے باری باری ہمارے گھر آتے ہیں۔ چار آتے ہیں چار جاتے ہیں۔ پہلے تو کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ اب تو ہمارے گھر میں بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور اور گڈی نے آہ بھری۔ میں اور ارشی اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ ابو نہ امی۔ وہ تو آنے جانے والوں کو پوچھنے میں لگے رہتے ہیں۔

اچھا میں نے ہمدردی جتانے کیلئے کہا۔

یہ سب چاچا کی وجہ سے ہے۔ چاچا نہ آتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ امی امی ہی رہتیں، ابو، ابو۔ چاچا چٹی سفید لوئی لپیٹ کر اور اتنی لمبی تسبیح پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اللہ میاں کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ باتیں ہی باتیں، باتیں ہی باتیں۔ اس وقت ابو بھی بیٹھک میں جا بیٹھتے ہیں اور امی دروازے میں جا کر کھڑی ہوتی ہیں اور گھر میں میں اور ارشی اکیلے رہ جاتے ہیں۔ تم بھی بیٹھک میں چلی جایا کرو۔ میں نے کہا۔

اونہوں، امی ابو غصے ہوتے ہیں۔ گھورتے ہیں۔ بات نہیں کرنے دیتے۔ خبردار چپ۔ پھر ہم چپ چاپ یہاں دروازے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر۔ پھر میرا جی چاہتا ہے کہ اللہ میاں سے پوچھوں تم ہمارے گھر کیوں آ گئے ہو۔ پر میں پوچھتی نہیں۔ بری بات ہے۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہوگئی پھر بولی پہلے تو ایسا نہیں تھا غنو۔ پہلے تو امی ابو کہا کرتے تھے ارشی گڈی گھر آ جائیں تو گھر گھر بن جاتا ہے۔ پہلے تو وہ ہمارا انتظار کیا کرتے تھے کہ کب ہم آئیں اور گھر تھر بنے۔

گڈی کی باتیں سن کر میں نے محسوس کیا کہ اس کے ننھے سے دل پر صدمہ ہوا ہے۔ میں نے سوچا اگر اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے تو شاید اسے سکون مل جائے۔ میں نے کہا کیا گاؤں کے سارے لوگ تمہارے گھر آتے ہیں۔

ہاں وہ بولی۔ سارے۔

چھوٹا سا تو گاؤں ہے یہ۔ میں نے کہا۔

چھوٹا سا تو نہیں۔ وہ بولی۔ ابو کہتے ہیں یہ گاؤں نہیں قصبہ ہے۔ کتنے سو پکے گھر ہیں۔ دو بازار ہیں اور ارد گرد گلیاں ہی گلیاں۔ بہت ساری گلیاں۔ باہر دو باغ ہیں۔ ایک پکا تالاب ہے۔ دو مدرسے ہیں۔ ایک بڑا ایک چھوٹا۔ چھوٹے مدرسے میں ابو پڑھاتے ہیں۔ ابو بچوں کو مارتے نہیں نہ ہی ڈانٹتے ہیں۔ وہ تو انہیں بڑا پیار کرتے ہیں۔ پہلے بچوں کو گھر لے آیا کرتے تھے کسی کو کچھ کھلانے کے لئے، کسی کو کچھ دینے کے لئے۔ کسی کو سبق یاد کرانے کے لئے۔ اس پر امی بہت بگڑتی تھیں۔ کہتی تھیں یہ کیا روز کسی نہ کسی کو انگلی لگا کر گھر لے آتا ہے۔ کسی کو کہتا ہے آ تجھے گڑ کے چاول کھلائیں، کسی کو کہتا ہے آ تجھے روٹی کھلائیں۔ یہاں کیا بھنڈارا کھلا ہوا ہے۔ میرا گھر کیا یتیم خانہ ہے۔ ہاں۔

امی ابو کو ڈانٹتی تو ابو سخت گھبرا جایا کرتے تھے اور منہ سے سی سی کیا کرتے تھے۔ جیسے بہت کچھ سننا پڑ رہا ہو۔ پھر وہ امی کو سمجھاتے لیکن امی کب سمجھتی ہے۔ پھر وہ ہار کر امی کی منتیں کرنے لگتے اس پر بھی امی نہ مانتی تو ابو گردن لٹکا کر ایک طرف جا بیٹھتے۔ پھر بھی امی بڑ بڑ کرتی رہتی اور بہانے بہانے ان کے ارد گرد پھرتی اور بولے جاتی، بولے جاتی۔ پھر ہار کر ابو کہتے۔ اچھا گڈی کی ماں جو تو نہیں پسند کرتی تو نہ سہی۔ اب میں کسی کو گھر نہیں لاؤں گا۔ اور پھر پتہ ہے کیا ہوتا۔ اگلے دن ہی وہ کسی مسافر کو گھر لے آتے اور پھر امی کی منتیں کرنے لگتے۔ گڈی کی ماں بیچارہ مسافر ہے یہاں اس کا کوئی نہیں بس ایک رات ہی رہنا ہے اس نے کل چلا جائے گا۔

اچھا، میں نے کہا۔ تمہارے ابو تمہاری امی سے بہت دبتے ہیں۔

صرف امی سے ہی نہیں۔ وہ بولی۔ ابو تو ہر کسی سے دب جایا کرتے تھے۔ مزدور کی پیٹھ سے بوری گر جاتی تو وہ راہ چلتے رک جایا کرتے اور بوری اٹھا کر اس کی پیٹھ پر رکھ

دیتے۔ کوئی ان جان کسی کے گھر کا راستہ پوچھتا تو بھی رک جاتے اسے راستہ بتاتے رہتے
سمجھاتے رہتے۔ پھر بھی تسلی نہ ہوتی تو اس کے ساتھ چل پڑتے آؤ میں تمہیں سمجھاؤں آ
جاؤ۔ پھر اسے گھر تک پہنچا کر واپس آتے۔ یہ جب کی بات ہے اب کی نہیں۔ اب تو وہ
مدرسے سے آ کر سارا سارا دن بیٹھک میں بیٹھ رہتے ہیں نا۔ پہلے یہ بات نہیں تھی۔ پہلے تو
وہ لوگوں کے کام کیا کرتے تھے۔ اور لوگ ان سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔

اور اب نہیں پیار کرتے کیا۔ میں نے پوچھا۔

اب تو لوگ ان کے ہاتھ چومتے ہیں۔ گلے میں ہار ڈالتے ہیں۔ گڈی نے منہ بنا
کر یوں کہا جیسے ہاتھ چومنا پیار کی بات نہ ہو۔ تمہارے ابو تو بڑے نیک آدمی ہیں۔ میں نے
کہا۔

ہاں وہ بولی۔ بڑے نیک آدمی تھے میرے ابو۔ اور وہ نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔
گھر پر ہی پڑھتے تھے۔ صرف جمعہ کے دن مسجد میں جایا کرتے تھے۔ مسجد میں چپ چاپ
کونے میں جا بیٹھتے کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ بیٹھے ہیں۔ گھر پر بھی نماز پڑھتے تو ہمیں پتہ ہی
نہ چلتا چپ چاپ اندر کوٹھری میں گھس کر پڑھ لیتے۔ یا چپکے سے کوٹھے پر چڑھ جاتے اور
برساتی میں پڑھ لیتے یوں چھپ چھپ کر پڑھتے تھے جیسے نماز پڑھنا کوئی اچھا کام نہ ہو۔ ایسا
کام نہ ہو جو لوگوں کو دکھانے کے لائق ہو۔ وہ چپ ہو گئی۔

اور تمہاری امی بھی پڑھتی تھیں نمازیں۔ میں نے بات چلائی۔

ہاں، وہ بولی امی تو بڑے رعب سے نمازیں پڑھا کرتیں تھیں۔ ابھی وضو کرنے
بیٹھی بھی نہیں کہ سارے گھر کو پتہ چل گیا کہ امی نماز پڑھنے لگی ہیں۔ پھر جب مصلے پر کھڑی
ہوتی تو ہم کو خبردار کرتی۔ ارشی ادھر سے نہ گزرنا میں نماز پڑھنے لگی ہوں اور دیکھنا شور نہ مچانا
خبردار میں نماز پڑھنے لگی ہوں۔

جب تک امی نماز پڑھتی میں اور ارشی سہمے ہوئے بیٹھ رہتے۔ کھیلنا بند کر دیتے کہ
کہیں بے دھیانی میں اُدھر سے نہ گزر جائیں۔ چلا کر بات نہ کر بیٹھیں۔ میں تو نہیں بھولتی
تھی پر ارشی بھول جاتا اور پھر امی سے پٹتا۔ اور صرف ہمارے سامنے ہی نہیں گڈی بولی۔ امی
تو سب کے سامنے اپنی نماز کا ڈھنڈورا بجایا کرتی تھی محلے والیوں کو کوئی بات سناتی تو کہتی
اے عصر کا وقت تھا ابھی میں وضو کر ہی رہی تھی تو میں نے باہر شور سنا۔ اس طرح گڈی ہنسنے
لگی۔

یا پھر کسی کی چغلیاں کرتے ہوئے امی رک جاتی اور کہتی ٹھہر جا بہن میں دو سجدے
دے آؤں پھر بتاؤں گی تجھے اس منہ مٹی لاچی احمداں کی کرتوت۔

یا پھر باتوں ہی باتوں میں کہتی اے بہن ہماری نمازیں کیا نمازیں ہیں۔ وہ تو
ٹکریں ہیں، ٹکریں۔ بس ٹکریں مار لیتی ہوں میں۔ ہونہہ ٹکریں، گڈی نے منہ بنا کر کہا۔
ٹکریں مارتے وقت کیا یہ کہا کرتے ہیں کہ خبردار یہ نہ کرنا وہ نہ کرنا۔

بالکل ٹھیک۔ میں نے لقمہ دیا۔

میں ابا سے کہا کرتی تھی ابو شکر ہے آپ امی کی طرح نماز نہیں پڑھتے۔ پر اب تو
جب سے اللہ میاں ہمارے گھر آئے ہیں ابو بھی امی کی طرح نماز پڑھنے لگے ہیں۔ اور اب
وہ بھی امی کی طرح مسئلے کرنے لگے ہیں۔

اچھا تو کیا تمہاری امی مسئلے بھی کیا کرتی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

ہاں، وہ بولی۔ امی تو یوں مسئلے کیا کرتی ہیں جس طرح ارشی میٹھی گولیاں چوستا
ہے۔ وہ تو بات بات پر مسئلوں کے حکم سناتی رہتی تھیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ شلوار کے پائنچے
چوڑے نہ رکھو۔ پاجامہ گٹوں سے اونچا ہے۔ نیچے نہ گرے۔ بال کھلے نہ چھوڑو۔ دوپٹہ سر
سے نہ گرے۔ مسئلے ہی مسئلے۔ خالی باتیں ہی باتیں۔

کہنے کو امی کہا کرتی تھی روٹی کھانے سے پہلے پوچھ لو کہ پڑوس میں کوئی بھوکا تو
نہیں۔

تو اس میں کیا برا ہے۔ میں نے کہا۔

پھر جب ابو مسافر کو ساتھ لے آتے تھے تو امی انہیں غصے کیوں ہوتی تھی۔ یہ کیوں
کہتی تھی کہ میں نے بھنڈارا لگا رکھا ہے یہاں۔ اور کہتی تھی اب میں پھر تو ارکھوں نہ مجھ سے
نہیں ہوتا۔ امی جب مسئلے کرتی تو ایسا لگتا جیسے مولوی صاحب ہو۔ خالی باتیں ہی باتیں۔
باتیں ہی باتیں۔

اور ابا نے کبھی مسئلہ نہیں کیا تھا۔ انہیں باتیں کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔
دوسرے باتیں کرتے اور وہ چپ چاپ سنتے رہتے تھے۔ ہاں جی ہاں، جی بجا ہے بجا ہے۔
اس پر امی طعنہ دیتی یہ کیا ہوا بھلا۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ بجا ہے، بجا ہے۔
وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی یہ تو ان دنوں کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے گھر میں خوشی ہی خوشی تھی۔
پر اب۔

اب کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔

اب تو چاچا انگلی لگا کر اللہ میاں کو یہاں لے آئے ہیں۔ عین اس وقت بیٹھک
سے شور اٹھا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ، شور سن کر وہ رک گئی اور اس نے برا سا منہ بنایا۔ چاچا نہ
آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے زیر لب کہا۔

پہلے تمہارے چاچا کہاں رہتے تھے۔

اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ بولی۔ اُدھم پور میں۔ ایک بار ہم بھی گئے تھے
اُدھم پور چاچا کے پاس۔ امی ابا ارشی میں سب پورا ایک ہفتہ رہے تھے وہاں۔ مجھے تو چاچا کا
گھر ذرا بھی اچھا نہ لگا تھا۔ چھوٹا سا گھر۔ دو کوٹھڑیاں اور کچا ویہڑا۔ مٹی ہی مٹی، مٹی ہی

مٹی۔ ارشی اور میں ویہڑے میں کھیلتے تو دھول اڑتی۔ پھر چاچی گھورتی۔ ارشی گڈی یہاں نہ
کھیلو دھول اڑ رہی ہے۔ گھر سے باہر وہ ہمیں جانے نہ دیتی تھی۔ باہر بڑا اچھا میدان تھا۔
جس میں بچے کھیلتے تھے۔ پر چاچی ہمیں نہ جانے دیتی۔ کہتی نہ بھئی باہر نہ جاؤ۔ لوگ کیا کہیں
گے کہ مولوی صاحب کے بھائی کے بچے آوارہ بچوں سے کھیلتے ہیں۔

وہاں چاچے کے گھر میں ارشی اور مجھ پر بڑی روکیں تھیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔
وہاں نہ جاؤ، یہاں مت کھڑے ہو۔

تو کیا تمہارے چاچا کے گھر کوئی لڑکا لڑکی نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔

اونہوں، وہ بولی۔ ان کا کوئی بچہ نہیں۔ صرف چاچا اور چاچی گاؤں کی مسجد کے
مولوی تھے تا اس لئے ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ لوگ جھک کر سلام کرتے۔ انہیں سبھی
مولوی اکبر کہہ کر بلاتے تھے اور ان سے مسئلے پوچھتے رہتے۔ پھر جمعہ کے دن تو مسجد سے ان
کی آواز گھر تک آتی تھی۔ اس روز وہ کھڑے ہو کر وعظ کرتے۔ کرتے ہی جاتے۔ باتیں ہی
باتیں۔ مسئلے ہی مسئلے۔

مسجد کے مولوی جو تھے۔ میں نے کہا۔

نہیں نہیں خالی مولوی نہیں۔ وہ بولی۔ گاؤں میں ان کی دکان بھی تھی۔ اس میں
میٹھی گولیاں تھیں۔ تختیاں تھیں، قاعدے تھے، کتابیں تھیں، سلیٹیاں تھیں۔ کاپیاں تھیں، بڑا
کچھ تھا دکان میں۔ پر وہ دکان بھی تو چاچے نے مسجد بنا رکھی تھی۔ سارا دن لوگ بیٹھے رہتے۔
حقہ گڑ گڑ چلتا اور مسئلے چلتے۔ مسئلے ہی مسئلے۔ جس طرح آج کل ہماری بیٹھک میں چلتے
ہیں۔ باتوں کا جھاڑ بندھا رہتا ہے۔ پر اب چاچا مولوی اکبر نہیں رہا اب تو سب انہیں
حضرت صاحب کہتے ہیں۔ ہاں سچی۔

سچ، میں نے کہا۔ حضرت صاحب کیوں کہتے ہیں۔

پتہ نہیں۔ وہ بولی۔ امی کہتی ہے انہیں حضرت صاحب کہو۔ چاچا نہ کہو۔ خبر دار۔

اچھا، میں نے کہا۔ پھر کیا ہوا اُدھم پور میں۔

کچھ بھی نہیں۔ وہ بولی۔ بس وہاں تو رکاوٹیں ہی رکاوٹیں تھیں کوئی اونچی آواز سے بولتا نہ تھا۔ مولوی صاحب کا گھر جو تھا۔ جو لوگوں کو مسئلے سناتا رہے اسے دھیان رکھنا ہی پڑتا ہے تاکہ منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے۔

کوئی ایسی بات کرنی ہوتی تو چاچا چاچی کوٹھڑی میں گھس جاتے اور اندر سے کنڈی بند کر لیتے پھر وہ دیر تک اندر کھسر پھسر کرتے رہتے۔

ایک دن جب ابا امی کسی سے ملنے گئے ہوئے تھے اور چاچا چاچی بند کوٹھڑی میں کھسر پھسر کر رہے تھے تو میں اور ارشی دروازے سے کان لگا کر سنتے رہے۔ پر ہمارے پلے کوئی بات نہ پڑی۔ بس ایک ہی بات سنائی دی۔ چاچا بار بار کہہ رہے تھے۔ نیک بخت جو تیار جی چاہے کر میں تجھے منع نہیں کرتا بس گاؤں والوں کو پتہ نہ چلے۔ توبہ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگی۔

ہاں میں نے کہا۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو، کیا مصیبت ہے۔

نہیں غفو، وہ چلا کر بولی۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو ہوتا تو اتنی مشکل نہ ہوتی۔ مشکل تو یہ ہے کہ کرو جو مرضی، پر کوئی دیکھ نہ لے، سن نہ پائے، جان نہ لے، ہے نا۔ اس نے مجھ پر سوالیہ نگاہ دوڑائی پھر جواب سنے بغیر کہنے لگی۔ وہاں چاچا کے گھر میں مجھے اتنی خوشی ہوئی اتنی خوشی ہوئی، اس بات پر کہ شکر ہے میرے ابو مولوی صاحب نہیں ہیں۔ نہیں تو ہمیں بھی مصیبت پڑ جاتی ہے نا غفو۔

ہاں میں نے کہا۔

اس پر گڈی خوش ہوگئی۔ کہنے لگی۔ وہاں چاچا کے گھر میں میرا دم گھٹتا تھا۔ ابو بھی

اکھڑے اکھڑے رہتے تھے ارشی بھی چپ چپ تھا۔ پر امی بڑی خوش تھی۔ ایسے لگتا جیسے بطخ پانی میں آ گئی ہو۔ امی تو چاچا چاچی کے ساتھ اتنی رچ بس گئی تھی کہ جب بھی وہ صلاح مشورے کے لئے بند کمرے میں جاتے تو امی کو ساتھ لے جاتے اور امی بڑے جوش سے بولتی اور چاچی بار بار کہتی اے آہستہ بول بہن دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔

کتنی دیر تم اُدھم پور رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

بولی، رہے تو ایک ہفتہ تھے پر وہ ہفتہ مہینے سے زیادہ لمبا ہو گیا تھا ہاں۔

اچھا پھر، میں نے پوچھا۔

پھر ہم واپس آ گئے۔ پھر ایک دن ابو نے بتایا کہ چاچا حج کرنے مکے مدینے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایک روز اُدھم پور سے ایک آدمی آیا اس نے بتایا کہ چاچی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ اس پر ابو اُدھم پور چلے گئے اور چاچی کو ہمارے گھر لے آئے جب چاچی ہمارے گھر آئی تو وہ بھلی چنگی تھی۔ ذرا بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ مگر اگلے دن ہی اسے پھر دورہ پڑ گیا اور وہ مر گئی۔

تت تت، بیچاری۔ میں نے کہا۔

ابو نے چاچا کو خط لکھ کر خبر کر دی۔ پھر حج کر کے چاچا سیدھے پہلاں والی آ گئے۔

جب چاچا آئے تو ان کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بال بڑھا کر پٹے بنے ہوئے تھے۔ منہ پر اتنی لمبی داڑھی تھی۔ ماتھے پر محراب بنی ہوئی تھی۔ کرتے کی جگہ اتنا لمبا چغہ لٹک رہا تھا۔ ہاتھ میں موٹا سا کھونڈ تھا۔

جب چاچا آئے تو ہمارے گھر میں لوگ جمع ہو گئے۔ پہلے دو دن تو چاچی کی موت کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر چاچا نے حج کی باتیں سنانا شروع کر دیں۔ پھر اللہ کی باتیں چھیڑ دیں۔ یوں باتیں کرتے تھے جیسے اللہ سے مل کر آ رہے ہوں۔ جیسے اللہ نے انہیں کہا ہو کہ جا

کرلوگوں کو بتاؤ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کیا نہیں چاہتے۔ کس کو اچھا جانتے ہیں کس کو اچھا نہیں جانتے۔ پھر اللہ کی بات اتنی چلی اتنی چلی کہ ہمارا سارا گھر اللہ سے بھر گیا۔ اللہ کی باتیں سننے کے لئے لوگ ہمارے گھر آنے لگے اور چاچا مولوی اکبر سے حضرت صاحب بن گئے اور لوگوں نے نذر نیاز کی ٹوکریاں لانی شروع کر دیں۔ ٹوکریاں ہی ٹوکریاں۔ ڈبے ہی ڈبے۔ اتنی ٹوکریاں اور ڈبے آئے کہ امی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں موم بتیاں سی جلنے لگیں اور وہ بیٹھک کی طرف اٹھ بھاگی۔ اشارہ کر کے چاچا کو اندر بلایا۔ دونوں بند کوٹھڑی میں باتیں کرتے رہے۔ اسی طرح جس طرح اُدھم پور میں چاچا چاچی باتیں کیا کرتے تھے۔

اچھا پھر، میں نے گڈی سے پوچھا۔ دراصل مجھے اس سارے قصے سے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ مجھے تو صرف گڈی سے دلچسپی تھی۔ اسے اُداس دیکھ کر میرا دل دکھ گیا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اس سے کچر کچر باتیں کروں۔ کتر کتر کر باتوں کا ڈھیر لگا دوں تاکہ اس میں اکیلے پن کا دکھ نہ رہے۔ گھر میں جو کسمپرسی اور بیگانگی بھری ہوئی تھی وہ دور ہو جائے۔

اچھا پھر، میں نے گڈی کو پھر چھیڑا۔

بس پھر اس روز کے بعد چاچا بالکل ہی بدل گئے۔ انہوں نے اتنی لمبی تسبیح بنا لی۔ ساری بیٹھک میں یا اللہ کے اشتہار لگا دیئے اتنے سارے اشتہار لگا دیئے کہ ساری بیٹھک اللہ میاں سے بھر گئی۔ پھر وہ بند کمرے میں نماز پڑھنے لگے۔ وظیفے کرنے لگے اور امی نے انہیں حضرت صاحب کہنا شروع کر دیا۔ لوگ آتے تو امی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ بھائی حضرت صاحب عمل میں ہیں ٹھہر کر آئیں گے باہر۔ تم جب تک ذکر کرو۔ کبھی امی کہتی حضرت صاحب نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ کل آنا اور پھر جب لوگ چلے جاتے تو امی چاچا کے کمرے میں داخل ہو جاتی اور وہ گھنٹوں وہاں ہولے ہولے باتیں کرتے

رہتے۔ اس وقت ارشی چلاتا گڈی یہ اچھا چپ کا روزہ ہے وہ تو باتیں کرتے ہیں۔ پھر امی باہر نکل کر ہمیں پیٹتی خبردار جو پھر ایسی بات کی تو۔ اور تم اب انہیں چاچا نہ کہا کرو۔ حضرت صاحب کہا کرو سنا تم نے۔

اور تمہارے ابو وہ نہیں کہتے تھے کچھ۔

کچھ بھی نہیں۔ پہلے تو حیران رہتے تھے۔ گڈی نے جواب دیا۔ کبھی چاچا کی طرف دیکھتے تھے کبھی امی کی طرف اور کبھی نذر نیاز کی ٹوکریوں کی طرف اور پھریری سی کرتے تھے جیسے بہت کچھ سننا پڑ رہا ہو۔ بہت کچھ۔ پھر ایک روز امی نے ابو کی بانہہ پکڑ لی، انہیں اندر لے گئی اور پھر اتنا ڈانٹا اتنا ڈانٹا اور کہنے لگی چل چل کے حضرت صاحب کے پاس بیٹھ۔ ان کے دائیں ہاتھ۔ اور خبردار جو ادھر اُدھر سرکا۔ اور ابو چپ چاپ حضرت صاحب کے پاس جا بیٹھے اور لوگوں نے حضرت صاحب کے ساتھ ابو کے ہاتھ بھی چومنے شروع کر دیئے اور ابو کے گلے میں بھی ہار ڈالنے شروع کر دیئے۔ پھر ابو سبحان اللہ، سبحان اللہ کے نعرے لگانے لگے۔

ابو کے جانے کے بعد میں اور ارشی بالکل ہی اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ امی پوچھتی ہیں نہ ابو۔ کوئی ہمارے پاس نہیں بیٹھتا۔ ہم سے باتیں نہیں کرتا۔ بیٹھک میں جائیں تو امی ڈانٹتی ہیں۔ اور وہ خود سارا دن بیٹھک میں رہتی ہے۔ ابو بھی وہیں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔ ساری بیٹھک اللہ سے بھری رہتی ہے اور میں اور ارشی۔

وہ رک گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب کچھ ہی بدل گیا ہے غفو۔ وہ رونی آواز میں بولی۔ جب سے اللہ ہمارے گھر میں آئے ہیں سب کچھ بدل گیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اللہ میاں سے جا کر پوچھوں تم ہمارے گھر میں کیوں آ گئے ہو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔

عین اس وقت بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھلا اور گڈی کی امی باہر نکل آئی۔ ساتھ ہی اللہ اللہ کا شور سنائی دیا۔ گڈی نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا پھر شور مچا دیا امی امی ادھر دیکھو امی ہمارے گھر کون آیا ہے۔ گڈی تڑپ کر اُٹھ بیٹھی اور اپنی ماں کی طرف بھاگی جو بیٹھک کے بیرونی دروازے میں کھڑی تھی۔ امی امی وہ چلاتے ہوئے ماں کے پاس جا پہنچی۔

خاموش، ماں نے کھٹاک سے گڈی کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ دیکھتی نہیں اندر ذکر ہو رہا ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔ یہ کہہ کر ماں تو اندر بیٹھک میں چلی گئی اور گڈی وہاں کھڑی رونے لگی۔ میں نے لپک کر گڈی کو گود میں اٹھا لیا اور اُسے گھر لے آیا۔

بڑی دیر تک وہ روتی رہی اور میں اسے بہلاتا رہا۔

میں نے جھوٹ موٹ کہا گڈی میں تیرے لئے ایک اتنا پیارا نقش لایا ہوں اتنا پیارا ہے وہ کہ۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پہلے بھی ایک نقش دیا تھا۔ وہ جو کارڈ تھا نیلا یاد ہے۔

گڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یاد ہے وہ بولی۔

ویسا ہی نقش دوں گا۔ میں نے کہا۔

نہ میں نہیں لیتی۔ وہ بولی

کیوں؟ میں نے کہا۔

بس، وہ بولی نہیں لیتی۔

وہ پہلا والا تیرے پاس ہے نا ابھی۔ میں نے پھر بات شروع کی۔

ہاں۔ وہ بولی مگر اس کی آواز میں چہک نہ تھی۔

تیرے پاس ہے اس وقت۔

ہاں، وہ بولی دکھاؤں۔

دکھاؤ تو۔

گڈی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کارڈ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ نقش پھٹ کر دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ یہ تو پھٹ گیا ہے۔ میں نے کہا۔

پھٹا نہیں، وہ بولی۔ میں نے خود پھاڑ دیا۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بولی۔

جب میں نے اسے پھاڑا تھا تو میں اتنا روئی تھی اتنا روئی تھی۔ گڈی نے کہا کہ یہ سارا بھیگ گیا تھا۔

اچھا نہیں لگتا تو تم اسے اٹھائے کیوں پھرتی ہو۔ میں نے پوچھا۔

کہاں پھینکوں، وہ بولی ارشی کہتا تھا اسے زمین پر نہیں پھینکتے بے ادبی ہوتی ہے۔

غفو آپ اسے کنوئیں میں پھینک دینا۔

ہائیں، میں نے حیرانی سے پوچھا۔ تمہیں تو اللہ سے بڑا پیار تھا۔

ہاں، وہ بولی، تھا، ان دنوں جب اللہ چھپ چھپ کر دلوں میں رہتے تھے۔ پر اب تو وہ ہمارے گھر میں ڈیکس لگا کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہونٹوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور ہونٹ لٹکا دیئے۔